قرآن فہمی
آیت اللہ شہید استاد مرتضٰی مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)
www.shaheedmutahhari.com

قرآن فہمی

استاد شہید مرتضی مطہری

ملنے کا پتہ
معراج کمپنی اردو بازار لاہور

پہلی تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِہٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۲۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۲۷ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَۃٌ۰ۙ وَّاَنَّ اللہَ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۲۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللہَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَـيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۰ۭ وَاللہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۲۹

’’(مسلمانو!) اس وقت کو یاد کرو جب تم (سرزمین مکہ میں) بہت کم اور بالکل بے بس تھے، خوفزدہ تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں، تو اللہ نے تم کو (مدینہ میں) پناہ دی، اپنی مدد سے تمہاری تائید فرمائی اور تمہیں پاک و پاکیزہ نعمتوں سے سرفراز کیا تاکہ تم شکرگزاری کرو۔‘‘

قرآن مجید کا طریق کار یہ ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں اور مومنین کی توجہ ایمان کی طرف مبذول کرواتا ہے، یعنی سمجھانا چاہتا ہے کہ ایمان رکھنے اور حقیقی مسلمان ہونے کے بہت اچھے اثرات برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی پوری کوشش یہی ہے کہ ہم اس نکتہ و حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ قرآن ہرگز یہ نہیں فرماتا کہ ایمان و اسلام کے اچھے اثرات و نتائج صرف آخرت میں ہی برآمد ہوں گے، یعنی قرآن لوگوں سے وعدۂ فردا نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ فلاں عمل انجام دو، عبادت کی زحمت برداشت کرو اور ہم سے جہان آخرت میں ان کے بدلہ کی امید رکھو، یعنی یہ نہیں کہ تمہارا عمل نیک ایسے بیج کی مانند ہے جو تم نے اس دنیا میں بویا ہے لیکن اس کا پھل تمہیں آخرت میں ملے گا۔ یہ ایک نظریہ تو ہوسکتا ہے لیکن قرآنی نظریہ نہیں، تاہم یاد رہے کہ قرآن کا نظریہ مادی بھی نہیں ہے، یعنی قرآن کا یہ ادعا بھی نہیں کہ جو کچھ تم اس دنیا میں اکشت کروگے، اس کو اسی دنیا میں کاٹو گے اور فقط اس دنیا میں ہی اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ قرآن کے پیش نظر فقط مادی یعنی دنیوی منافع ہی ہوں۔ قرآن بنی نوع انسان کو یقین دلاتا ہے کہ ایمان کے اچھے نتائج و فوائد اخروی زندگی کے ساتھ ہی مختص نہیں ہیں بلکہ دنیا میں بھی انسان ان کے فوائد سے بہرہ مند ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوتا

ہے ’’وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ ......‘‘ یعنی اس دنیا میں ایمان سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، انہیں فراموش نہ کرو، ان فوائد کو پیش نظر رکھو۔ اس طرح تم ان پر زیادہ اعتماد کرو گے تو تمہارے اطمینان قلب میں اضافہ ہوگا۔

اس آیت میں صدراسلام کے مسلمانوں کو مخاطب کرکے یاد دلایا جارہا ہے کہ اسلام قبول کرنے اور اللہ پر ایمان لانے سے قبل جب تم کمزور تھے اور کفار تمہیں نیست و نابود کرنا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نئے حالات پیدا کردیے اور تمہاری حالت کو بہتر بنایا۔ تم بہت تھوڑے تھے، اسلام و ایمان کی بدولت تمہاری تعداد میں اضافہ ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے: ’’مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ‘‘ یعنی روئے زمین پر تم بہت کمزور تھے اور کسی حساب میں نہیں آتے تھے۔ لفظ ’’مستضعف‘‘ ’’ضعف‘‘ اور ’’ضعیف‘‘ سے مشتق ہے۔ ’’مستضعف‘‘ اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے کمزور گردانا جاتا ہو۔ عہدحاضر میں آپ دیکھتے ہیں کہ بعض قوموں کو کسی حساب میں نہیں لایا جاتا جبکہ دوسری قوموں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ پس ارشاد ہورہا ہے: ’’وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ‘‘ یعنی یاد کرو وہ وقت جب تم کسی حساب و شمار میں نہیں تھے جبکہ اب اسلام لانے اور مسلمان ہونے کی وجہ سے تمہیں اہمیت حاصل ہے۔ نہ صرف یہ کہ اقوام دیگر کے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ تم اتنے کمزور اور ناتواں تھے کہ خود بھی اپنے آپ کو حقیر جانتے تھے۔ اس وقت ممکن تھا کہ لوگ تم پر حملہ کرکے تمہیں اسی طرح اچک لے جاتے جس طرح گدھ چڑیا کو جھپٹ لے جاتا ہے۔ تم ڈرتے تھے کہ لوگ تم پر حملہ کرکے تمہیں برباد کرڈالیں گے۔ لیکن اسلام لانے اور شریعت اسلام اور دستور قرآن پر عمل پیرا ہونے کے بعد تمہیں پناہ ملی۔

پس آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کے اثرات اسی دنیا میں ظاہر فرما رہا ہے۔ اس نے تم جیسے کمزوروں کو قوت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتا ہے: ’’اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ‘‘ جن پاکیزہ نعمتوں سے تم محروم تھے، اللہ نے تمہیں دنیا میں ہی ان سے مستفیض فرمایا۔ دنیا کی جن نعمتوں سے دوسرے لوگ استفادہ کرتے تھے اور تم ان سے محروم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان نعمات میں سے پاکیزہ رزق تمہیں عطا فرمایا اور تم ان سے بہرہ مند ہوئے۔ تاہم تمہیں جاننا چاہیے کہ یہ تمہاری منزل مقصد نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کی نعمتوں کی جانب تمہیں متوجہ کرنے کا پیش خیمہ ہے۔ ان نعمتوں کے عطا کرنے کا مقصد اولین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کرو۔ ’’لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ‘‘۔

لفظ ’’شکر‘‘ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ ’’شکر‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ انسان بھلائی کرنے والے کی قدردانی کا اظہار کرے، مثلاً کہے ’’میں آپ کا ممنون ہوں۔‘‘ لیکن کیا اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہم ’’یااللہ تیرا شکر!‘‘ کہہ دیں اور بس؟ ہرگز ایسا نہیں۔ اللہ کے شکر کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ’’یااللہ تیرا شکر ہے‘‘ شکریہ کےالفاظ تو ضرور ہیں لیکن حقیقت شکر ہرگز نہیں شکر کی حقیقت کچھ اور ہے۔ مثلاً کلمہ ’’استغفراللہ‘‘ توبہ کے الفاظ تو ضرور ہیں، لیکن یہ حقیقت توبہ نہیں۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں پر نادم ہو اور آئندہ ان گناہوں کے ترک کرنے کا عزم مصمم کرے۔ ’’الہی استغفرک واتوب الیک‘‘ کہنے سے توبہ کے الفاظ تو ادا ہوجاتے ہیں، لیکن یہ خود توبہ نہیں۔ پس شکر، دقیق معنی کا حامل ہے جو عبارت ہیں قدردانی، حق شناسی اور جوہرشناسی سے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’شکر‘‘ کا لفظ اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بندہ کے لیے بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: ’’وَاللہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ‘‘ اللہ شکرگزار ہے، یعنی وہ اپنے بندوں کی اطاعت کو قدرکی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بندہ جب بھی اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ مستحق قدر ہوجاتا ہے۔ اللہ اپنے بندہ کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا یعنی وہ اپنے بندہ کے عمل کی قدر فرماتا ہے، اس کو ضائع نہیں کرتا۔ اگر انسان قدردان اور شکرگزار بننا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی اہمیت کو سمجھے، یعنی اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی نعمت کس مقصد کی خاطر ملی ہے تاکہ اس نعمت کو اسی مقصد کے حصول کے لیے کام میں لائے۔ شکر کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ’’استعمال الشی فیما خلق اللہ لاجلہ‘‘ یعنی جس مقصد کے پیش نظر کوئی چیز بنائی گئی ہو اسے اس مقصد کے حصول میں صرف کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھوں کی نعمت عطا فرمائی ہے، تو کیا اس کے شکر کے لیے صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ ’’یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہمیں آنکھیں عطا فرمائی ہیں؟‘‘ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل، فکر، محبت، احساس، اولاد، مال، سلامتی وغیرہ جیسی نعمات عطا فرمائی ہیں، پس اگر آپ ان سب کو انہی مقاصد کے لیے استعمال کریں جن کے لیے ان کو خلق کیا گیا ہے، ان کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے انہیں استعمال نہ کریں، تو اس صورت میں آپ شکرگزار کہلائیں گے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زبان کو بے فائدہ خلق نہیں فرمایا۔ اس کے ذریعے حقائق کو غلط رنگ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے، جھوٹ بولا جاسکتا ہے، لوگوں کو اذیت پہنچائی جاسکتی ہے، انہیں گالیاں بکی جاسکتی ہیں، لوگوں کی برائیوں کی تشہیر کی جاسکتی ہے، فحاشی پھیلائی جاسکتی ہے، افواہیں اڑائی جاسکتی ہیں۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کیا پروردگار عالم نے ہمیں زبان انہی مقاصد کی خاطر عطا فرمائی ہے، یعنی تہمت لگانے، غیبت کرنے کے لیے اور گالیاں بکنے کے لیے یا اس لیے عطا فرمائی

ہے کہ ہم اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچا سکیں؟ دوسروں کو اپنے مقاصد سے متعارف کروانا، انہیں تعلیم دینا، ان کی ہدایت کرنا، انہیں نصیحت کرنا، زبان کا شکر شمار ہوتا ہے۔ پس چاہیے کہ نعمتوں سے ہمیشہ صحیح فائدہ اٹھائیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ۸۰فیصد لوگ اپنی ذہنی قوت تخریب کاری میں صرف کرتے ہیں جبکہ اس کو علم و دانش کے حصول اور لوگوں کی بھلائی کے کاموںمیں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پس اے مومنین! تم کمزور تھے، محروم تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور دشمنوں کی دستبرد سے نجات دلائی۔ لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نعمتوں سے کس طور پر استفادہ کیا جانا چاہیے۔ ’’لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ‘‘کے یہی معنی ہیں۔

اس آیت میں لوگوں (مومنین) کو ان کے ماضی کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ ان کی تعدادقلیل تھی، وہ بہت کمزور تھے، خود ان کے اپنے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور دوسرے لوگ بھی انہیں کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات سے ان کی تائید فرمائی، انہیں قوی فرمایا اور ان کو نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ ان نعمات کو ان اہداف کی خاطر استعمال کریں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور جن میں ان کی سعادت ہے۔

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۲۷ (انفال:۲۷)

’’اے اہل ایمان! خدا اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو، حالانکہ تم سمجھتے بوجھتے ہو۔ ‘‘

(یہ آیت کا مفہوم ہے) اس آیت میں اللہ ، رسول، مسلمین اور اپنے ساتھ خیانت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ احکام الٰہی تمہارے پاس امانت ہیں ، ان کو مت چھوڑو اور نہ ہی ان میں تحریف کرو۔ اسی طرح رسول اکرم، مسلمین اور اپنے ساتھ بھی خیانت مت کرو۔ مسلمانوں سے خیانت، اللہ اور رسول سے خیانت کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ جنگ بدر کے دوران ایک ضعیف الایمان شخص نے اپنے مال اور اولاد کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں بلکہ اسلامی برادری کا ایک راز افشا کردیا اور اس کی مخبری کردی۔ قرآن فرماتا ہے کہ اللہ ، رسول اور خود اپنے ساتھ خیانت مت کرو۔ رسول اکرم رموزسیاسی کو بہت مخفی رکھتے تھے جب تک ضرورت اظہار پیش نہ آئے۔ اس لیے تاریخ

میں آتا ہے کہ کبھی بھی ایسا واقعہ پیش نہ آیا تھا کہ آپ جنگ کا ارادہ رکھتے ہوں اور کسی کو اس کی خبر ہوجائے۔ آپ فقط یہی فرماتے تھے کہ تیار ہوجاؤ ہم فلاں جانب جانا چاہتے ہیں۔ البتہ چند مواقع مثلاً جنگ تبوک کے سوا جب آپ نے فرمایا کہ ہمیں سوفرسخ راہ طے کرنا ہے۔ دشمن قوی ہے۔ یہ روم ہے قریش و عرب نہیں۔ تبوک کی جانب چلوہ تیس ہزار کا لشکر بہت ہی کم سازوسامان کے ساتھ روانہ ہوا حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کے پاس سواری تک نہ تھی۔ زمین بہت زیادہ گرم، اور سورج آگ برساتا تھا۔

رسول اکرم سوائے خاص موقعوں کے دوسرے کو اپنے ارادہ سے آگاہ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ جنگ بدر میں آپ نے ظاہر فرما دیا تھا۔ لہٰذا ایک ضعیف الایمان مسلمان نے قریش کو باخبر کردیا کہ نبی اکرم اور مسلمان ان کے ساتھ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے اہل و عیال اور مال قریش کے پاس تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ انہیں مسلمانوں کے ارادہ سے آگاہ کردے گا تو قریش اس کے بیوی، بچوں اور مال کو تحفظ فراہم کریں گے۔ اس طرح اگرچہ آیت میں تمام مومنین سے خطاب کیا جارہا ہے لیکن مدنظر صرف ایک خاص شخص ہے۔ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللہَ وَالرَّسُوْلَ '' یعنی اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کروہ حضرت امیرالمومنین ایک خط میں اپنے ایک عامل سے فرماتے ہیں: ''ان اعظم الخیانۃ خیانۃ الامۃ واقطع الغش غش الائمۃ'' سب سے بڑی خیانت وہ ہے جو معاشرے کے ساتھ کی جائے، فرد کے ساتھ نہیں۔ اگر کسی کا مال آپ کے پاس ہو، آپ خدانخواستہ اس کے مال یا اس کی ناموس کے ساتھ خیانت کریں تو آپ نے اس صورت میں بلاواسطہ طور پر ایک شخص کے ساتھ خیانت کی جبکہ بالواسطہ طور پر پورے معاشرے کے ساتھ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ لہٰذا مخبری کرنا پورے معاشرہ کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔ سب سے بڑی خیانت وہ ہے جو مسلمانوں کے راہنمائوں کے ساتھ کی جائے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اس ناخدا کو راستہ سے بھٹکانے کی کوشش کرے جو نیک نیتی کے ساتھ کشتی کو ساحل کی جانب لے جارہا ہو۔ اس صورت میں ناخدا سے خیانت پوری کشتی میں سوار لوگوں سے خیانت ہوگی۔ اس آیت سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے معاشرتی مسائل اجتماعی کو کتنی زیادہ اہمیت دی ہے۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللہَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۲۸ (انفال:۲۸)

پس یقین جانو کہ دولت اور اولاد تمہاری آزمائش کی چیزیں ہیں (کیونکہ اس شخص نے بیوی بچوں اور مال کی خاطر خیانت کا ارتکاب کیا تھا)

جو شخص ان کی محبت میں بھی اللہ کو نہ بھولے وہ دین دار ہے اور یقیناً اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔ قرآن میں لفظ ''فتنہ'' آزمائش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جان لو کہ یہی مال و دولت آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ یعنی تمہاری تمام تر توجہ بیوی اور بچوں ہی کی جانب نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں سےآخرت کا موضوع سامنے آتا ہے۔ بالفاظ دیگر تمہاری اہم ترین آرزو بیوی اور بچے نہیں ہونا چاہئیں، بلکہ یہ تو ایک ذریعہ ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَـيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۲۹ (انفال:۲۹)

''اے ایماندارو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے واسطے امتیاز کردے گا، تمہاری طرف سے تمہارے گناہوں کا کفارہ قرار دے گا اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا صاحب فضل و کرم ہے۔''

تقویٰ ''وقی'' سے مشتق ہے۔ ''وقی'' کے معنی حفاظت کرنا ہیں یعنی انسان ایسی حالت میں ہو کہ خود اپنی حفاظت کرسکے۔ مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر بری چیز سے اپنا دامن بچا کررکھے۔

قرآن فرماتا ہے کہ اگر صحیح معنی میں متقی بن جائو گے تو اس کے دو نتائج برآمد ہوں گے، ایک تو یہ کہ تقویٰ کے معنوی اثرات کے باعث تمہارے کام آسان ہوجائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص متقی ہو، پاکیزہ زندگی بسر کرے تو اسے کئی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور اگر اسے ایسے مسائل پیش آبھی جائیں تو حل ہوجاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تقویٰ انسان کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ شروع میں تو یہ بات مشکل نظر آتی ہے، انسان خیال کرتا ہے کہ بصیرت کا تقویٰ کے ساتھ کیا تعلق ہے، لیکن یہ خیال باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ متقی انسان زیادہ بابصیرت ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ روح کو پاکیزہ بناتا ہے۔ تقویٰ ان تمام تاریکیوں کو مٹا دیتا ہے جو انسان کو اس کی اپنی ذات کے ساتھ مختص بصیرتوں سے استفادہ نہیں کرنے دیتیں

چون غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

صد حجاب از دل بہ سوی دیدہ شد

(یعنی جب کوئی مطلب رکاوٹ پیدا کترا ہے تو ہنر پوشیدہ ہوجاتا ہے اور قلب و چشم کے درمیان سینکڑوں حجاب واقع ہوجاتے ہیں)

اگر آپ کے ذہن میں کسی چیز کے خلاف تعصب ہو تو آپ اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتے۔ تقویٰ تعصب کے گردوغبار کو صاف کردیتا ہے، بغض و عداوت کا خاتمہ کردیتا ہے جس کے نتیجے میں عقل آزاد ہوکر غوروفکر کے قابل ہوجاتی ہے۔ سعدی علیہ رحمۃ فرماتے ہیں:

حقیقت سرائی است آراستہ

ہوا و ہوس گرد برخاستہ

نہ بینی کہ ہر جا کہ برخاست گرد

نہ بنید نظر گرچہ بینا است مرد

تو را تا دلت باشد از حرص باز

نیاید بہ گوش دل از غیب راز

(یعنی حقیقت ایک سجائی ہوئی سرائے اور خواہشات نفسانی گردوغبار کی مانند ہیں۔ تم اس جگہ کو نہیں دیکھ سکتے جو گردوغبار سے اٹی ہوئی ہو۔ انسان اگرچہ بینا ہی ہو، اس کی آنکھ اس جگہ کو نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارا قلب جب تک حرص اور لالچ کی زد میں ہوگا، عالم غیب کا راز نہ سن سکے گا)

اس سلسلے میں امیرالمومنین کے دو جملے منقول ہیں جو بہت زیادہ بلندپایہ ہیں اور مطلب کو کھول کر بیان کرتے ہیں:

۱۔ اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع

''مصرع'' پچھاڑے جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے (مثلاً زمین کی وہ جگہ (اکھاڑا) جہاں کشتی میں پہلوان کی پشت لگتی ہے، اس کو ''مصرع'' کہتے ہیں)

ایسے بہت سے مقامات جہاں عقل کے پہلوان کی پشت زمین کےساتھ لگتی ہے یعنی جہاں عقل شکست کھاتی ہے، وہ ہیں جہاں انسان کے دل میں حرص و طمع پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ عجب المرء بنفسہ احد حساد عقلہ

انسان کی خودپسندی اس کی عقل کے حاسدوں میں سے ایک ہے۔ حاسد جس سے حسد کرتا ہے اس کا دشمن ہوجاتا ہے اور اسے نیست و نابود کردینا چاہتا ہے۔ خودپسندی عقل کو اس کے مقام سے گرادیتی ہے۔ پھر تقویٰ کیسے بصیرت میں اضافہ کرتا ہے؟ تقویٰ کی موجودگی میں طمع نہیں رہتا، خودپسندی نہیں رہتی، خواہشات نفسانی ختم ہوجاتی ہیں، گردوغبار نہیں رہتا، نور آجاتا ہے۔ اگر فضا میں کہریا دھواں ہو تو ایک میٹر تک کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں جبکہ تقویٰ پاکیزگی ہے یعنی یہ روح کی پاکیزگی کے مترادف ہے۔

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

دوسری تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللہَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَـیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ۰ۭ وَاللہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۲۹ (انفال:۲۹)

’’اے ایماندارو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے واسطے امتیاز کردے گا، تمہاری طرف سے تمہارے گناہوں کا کفارہ قرار دے گا، تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا صاحب فضل و کرم ہے۔‘‘

اس آیہ مجیدہ میں ایک مطلب بیان ہوا ہے جو حقیقت میں تین مطالب پر مشتمل ہے:

۱۔ تقویٰ کے اثرات

ہم جانتے ہیں کہ قرآن اور اسلام میں تقویٰ سے ایک خاص اصطلاح مراد ہے۔ عام لوگ بالخصوص دیہات کے رہنے والے تقویٰ اور طہارت کو ایک ہی چیز خیال کرتے ہیں (ان کے نزدیک طہارت و نجاست کا خیال رکھنے کا نام تقویٰ ہے)۔ لیکن قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ ایک ایسی روحانی حالت اور اخلاقی ملکہ کا نام ہے کہ جب وہ انسان میں پیدا ہوتا ہے تو انسان اپنے آپ کو گناہ سے بچانے لگتا ہے، چاہے اسے اس کی ترغیب ہی کیوں نہ ہورہی ہو۔ تقویٰ حق تعالیٰ کے اولیا کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ تقویٰ کا ملکہ اور اس سے متعلق فضیلتیں انسان کی روح پر اثرکرتی ہیں اور اسے لغزشوں اور گناہوں کے ارتکاب سے بچاتی ہیں۔

دنیا میں تقویٰ کا اثر

قرآن مجید میں تقویٰ کے تین اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک روحانی اثر ہے جو دنیا ہی میں ظاہر ہوجاتا ہے جبکہ دیگر دواثرات آخرت میں رونما ہوتے ہیں۔ دنیا میں (جیسا کہ آیہ مبارکہ میں ذکر ہوا) تقویٰ انسان کو صاحب بصیرت بناتا ہے کیونکہ اس سے انسان کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم اپنی ذات سے باہر روشنی

اور تاریکی دیکھتے ہیں اور ہمارے وجود سے باہر کی دنیا روشن اور تاریک ہوتی ہے، اسی طرح ہم اپنے اندر اور اپنے ضمیر میں بھی روشنی اور تاریکی کا احساس کرتے ہیں۔ بعض افراد کا ضمیر ایسا روشن ہوتا ہے گویا اس میں چراغ جلایا گیا ہو، جبکہ اس کے برعکس بعض افراد کا ضمیر تاریک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا چراغ بصیرت بجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ روشن ضمیر افراد کےپاس سب سے پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر طور پر نیک و بد کا ادراک رکھتے ہیں، وہ عیوب و نقائص کو جانتے ہیں اور ان کا اعتراف کرتے ہیں، جبکہ تاریک ضمیر رکھنے والے افراد اپنے نمایاں اور بڑے بڑے عیوب کا احساس بھی نہیں کرپاتے۔ بات فقط اتنی ہی نہیں ہے۔ فلسفی حضرات ایک نکتہ کی جانب متوجہ ہوئے ہیں، وہ یہ کہ انسان اپنی ذات کے علاوہ تمام دنیا کو اپنے وجود کی عینک اور آئینے کے تحت دیکھتا ہے۔ ہم آپس میں ایک دوسرے کو یا دنیا کو اپنے وجود کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ عینک سفید وشفاف ہوگی تو ہم دیگر اشیا اور دنیا کو اس اصلی حالت میں دیکھ سکیں گے۔ اگر یہ عینک غبارآلود وتاریک ہوگی تو پھر دنیا بھی ہمیں سیاہ اور تاریک ہی نظر آئے گی۔ یہ بہت دلچسپ نکتہ ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

گر بگردی تو...؟

تجربہ کرکے دیکھیں، اپنے اردگرد چکر لگائیں اور پھر رک جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کو ارد گرد کی تمام چیزیں گھومتی ہوئی نظر آئیں گی حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ درحقیقت آپ کا سر گھوم رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان صاحب تقویٰ اور روشن ضمیر و پاک و صاف ہو تو پھر وہ چھوٹی چیز کو چھوٹا، سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ ہی دیکھے گا۔

اگرچہ درج ذیل بات کسی حد تک ظریفانہ ہے، بہرحال مجھے یاد ہے کہ ایک بہت ہی فاضل و لائق خطیب، اشراقی قمی مرحوم شاید آپ میں سے کئی حضرات نے ان کا نام سنا ہو یا ان کی تقریر بھی سنی ہو، وہ ایران کے تقریباً نصف اول کے خطیب اور بہت بڑے عالم تھے، ایک مرتبہ برسر منبر اہالیان قم پر شدید تنقید فرما رہے تھے (آپ کی ان خوبیوں کے بہت لوگ معتقد تھے) وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ قم کے عام لوگ خرافات کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ قم کے لوگ کالی بلی کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کالی بلی خود ہم سے بھی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کالی بلی ان کے گھروں میں آتی ہے فوراً اس کو بہترین غذا اور گوشت کھلاتے ہیں جبکہ دوسری کسی

بلی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس بے چاری کو اتنا بھی نہیں دیتے جتنا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اسی لیے قم میں کالی بلیوں کے سوا دیگر تمام بلیاں ختم ہوگئی ہیں۔ تم اس شہر میں جدھر بھی دیکھو گے تمہیں فقط کالی بلیاں ہی نظر آئیں گی اور وہ بھی موٹی تازی۔ تقریر کے بعد جب وہ منبر سے اترے تو وہاں خرم آباد کا باذوق طالب علم موجود تھا۔ اتفاق سے اشراقی مرحوم سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ جب وہ منبر سے اتر کر بیٹھے تو طالب علم نے خرم آبادی زبان میں بہت سادہ و لطیف انداز میں عرض کیا ہمیں تو اس شہر میں کہیں کالی بلی نظر نہیں آتی۔ آپ نے چونکہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے اس لیے آپ کو ہر بلی سیاہ ہی نظر آتی ہے۔

اشراقی مرحوم یہ سن کر بہت ہنسے۔ لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسان سیاہ چشمہ لگا لے (ہرچند کہ یہ ایک مزاحیہ واقعہ تھا) تو اس کو ہر بلی سیاہ ہی نظر آئے گی۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہارا باطنی چشمہ سفید ہو اور تم دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھ سکو۔ اِنْ تَتَّقُوا اللہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (۷) یعنی اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے، اگر تمہارا باطن پاک ہوگا ، اگر تم اپنے اندر کی تاریکیوں کو ختم کردو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں حق و باطل کو پہچاننے کی کسوٹی عطا فرما دے گا جس کے ذریعہ تم حقائق کو بخوبی پہچان سکو گے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں روشنی عطا فرمائے گا۔ پس تقویٰ کی مدد سے انسان کا باطن منور ہوجاتا ہے جس کی بنا پر انسان صاحب بصیرت بن جاتا ہے پھر جب اس کے اندر بصیرت پیدا ہوجاتی ہے تو سب سے پہلے خود اپنی ذات کو اچھی طرح دیکھ پاتا ہے، اپنے بارے میں صحیح اندازہ قائم کرتا ہے، اسے اپنا آپ اتنا ہی نظر آتا ہے جتنا وہ حقیقت میں ہوتا ہے۔ پس وہ نہ تو اپنے آپ کو اپنی حقیقت سے بڑا دیکھتا ہے، نہ ہی چھوٹا۔ اسے اپنی ذات میں موجود تاریکیاں اور عیوب صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ بصیرت کی مدد سے، چونکہ انسان کو اس طور پر خلق کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے وجود کی عینک سے ہی دیکھتا ہے، اپنے وجود کی عینک کے شفاف ہونے کے باعث وہ دنیا کو بہتر طور پر دیکھ سکتاہے اور بہتر طور پر مشخص کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اشخاص واقعی متقی ہیں، اگر ان کا موازنہ ایسے اشخاص کے ساتھ کیا جائے جو تقویٰ کے علاوہ باقی ہر اعتبار سے ان کے برابر ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے فیصلے دوسروں کے فیصلوں سے بہت بہتر ہوں گے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کے اشخاص کو الہام ہوتا ہے، یعنی ہم کہتے

ہیں کہ وہ پاکیزہ انسان ہیں، ان کو الہام ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ کا ایک اثر ہے جو دنیا میں رونما ہوتا ہے۔

تقویٰ کا اثر آخرت میں

تقویٰ کا اثر آخرت میں یہ ہے کہ وہ انسان کے پچھلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ تقویٰ پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے، یعنی پچھلے گناہوں کو محو کردیتا ہے۔ وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۰ۭ یعنی پچھلے گناہوں کا اثر زائل کردیتا ہے کیونکہ حقیقی تقویٰ توبہ کا جزو ہوتا ہے۔ جو شخص ماضی میں گناہوں سے آلودہ ہوچکا ہو، وہ فقط اس وقت ہی متقی بن سکتا ہے جب ان گناہوں سے توبہ کرلے۔ اس طرح پچھلے گناہوں کا اثر ختم ہوجاتا ہے اور انسان اخروی عذاب سے بھی بچ جاتا ہے، یعنی پھر اللہ اپنے متقی بندہ کو پچھلے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا وَاللہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (اللہ تعالیٰ فضل عظیم کا مالک ہے)۔

قرآن کریم ان آیات میں ہمیں اس بات کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر ہمارا ایمان حقیقی ایمان ہو، ہمارا عمل اسلامی عمل ہو اور اگر ہمارا معاشرہ واقعی مسلمان معاشرہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی گوناگوں عنایات ہمارے شامل حال ہوں گی اور کامیابیاں ہمارے قدم چومیں گی۔ ان میں سے ایک یہی آیت میں نے تلاوت کی ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللہَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا یعنی تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہارے اندر بصیرت پیدا ہو۔ پس یہ بذات خود کتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ کوئی فرد یا کوئی معاشرہ بابصیرت ہوجائے۔

بعض اوقات قرآن مجید اسی کو بنیاد بنا کر کوئی واقعہ بیان فرماتا ہے، یعنی تاریخ مسلمین سے ایسے واقعات بیان فرماتا ہے جن کے ذریعہ مسلمانوں کو بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے نبی کو اور آپ کی بدولت ان مومنین کو جو آپ کے ساتھ تھے، حق، اللہ اور تقویٰ کے راستے پر گامزن ہونے کی وجہ سے اپنی تائید سے نوازا اور کن کن مشکلوں سے نجات دلائی۔ اس کے برعکس ان کے دشمنوں کو ان کی تمام تر قدرت و سطوت و طنطنہ و طمطراق کے باوجود نیست و نابود کردیا۔ قرآن ان سب باتوں کو عملی درس کی صورت میں بیان فرما رہا ہے: وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ۰ۭ وَيَمْكُـرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللہُ۰ۭ وَاللہُ خَيْرُ الْمٰكِـرِيْنَ۳۰ (انفال:۳۰) (اے رسول وہ وقت یاد کرو) جب کفار تم سے فریب کررہے تھے تاکہ تم کو قید کرلیں یا مارڈالیں یا تمہیں (گھر سے) نکال باہر کریں۔ وہ تو یہ تدبیر کررہے تھے اور

اللہ بھی (ان کے خلاف) تدبیر کررہا تھا اور اللہ تو سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔

اس آیت میں تاریخ اسلام کے ایک حساس موقع کو بیان کیا جارہا ہے۔ قرآن بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انتہائی سخت مشکلات میں اسلام اور مسلمانوں کو نجات دی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اسلام حقیقی اور ایمان حکم فرما تھے۔ ان مشکلات میں سے ایک مسئلہ پیغمبراکرم کی ہجرت سے متعلق ہے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب پیغمبراکرم کی ہجرت کا موجب بننے والا مسئلہ بہت حیران کن ہے۔ پیغمبراکرم کو بعثت کے ابتدائی دس سال کے دوران جب حضرت ابوطالب جو حضرت علی کے والدبزرگوار تھے، اور زندہ تھے، کی حمایت حاصل ہونے کی وجہ سے نسبتاً کم اذیت پہنچائی گئی۔ حضرت ابوطالب کی وفات کے چند دن بعد ہی آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یہ خاتون واقعتاً ہمدرد وغمگسار شریک حیات تھیں اور روحانی طور پر پیغمبراکرم کے ساتھ اس حد تک ہمدردوہم آہنگ تھیں جس کی کائنات میں مثال نہیں ملتی۔ آپ بہت زیادہ وفادار اور عقلمند تھیں۔ آپ نے اپنامال، جان، وجود، خوشی، سعادت یہاں تک کہ ہر چیز پیغمبراکرم کے قدموں پر قربان کردی تھی۔ حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد رسول اکرم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب ذریعہ استعانت مہیا فرمادیا۔

اس زمانہ میں مدینہ کے لوگ دو قبیلوں میں منقسم تھے۔ ایک کا نام اوس اور دوسرے کا خزرج تھا۔ دونوں قبیلے ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے۔ ان میں سے اسعد بن زرارہ نامی ایک شخص قریش کی مدد حاصل کرنے کی خاطر مکہ آیا اور ایک قریشی کے گھر میں بطورمہمان ٹھہرا۔ کعبہ قدیم زمانہ سے ہی عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا اگرچہ اس وقت اسے بت خانہ ہی شمار کیا جاتا تھا۔ طواف کعبہ کی رسم جو حضرت ابراہیم کے زمانہ سے مروج تھی ابھی تک چلی آرہی تھی۔ جو بھی مکہ آتا خانہ کعبہ کے گرد ایک طواف ضرور کرتا تھا۔ یہ شخص جب خانہ کعبہ کی زیارت اور اس کے طواف کو چلا تو اس کے میزبان نے اس سے کہا: ''احتیاط سے کام لینا۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو جادوگر ہے۔ بعض اوقات وہ مسجدالحرام میں آکر عجیب و غریب دل کو لبھانے والی باتیں کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تو کسی وقت اس کے کلام کو سن لے جو تجھے بے اختیار کردے۔ اس کے کلام میں جادو ہے۔'' جب وہ شخص طواف کعبہ کے لیے گیا تو اتفاق سے نبی اکرم کعبہ کے قریب حجر اسماعیل کے پاس تنہا تشریف فرما تھے اور قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس شخص کے کانوں

میں روئی ٹھونس دی گئی تھی کہ وہ نبی اکرمؐ کا کلام نہ سن پائے۔ وہ طواف میں مصروف تھا کہ ایک شخص کے چہرے نے اسے اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کرلیا (پیغمبراکرمؐ کا چہرہ مبارک انتہائی جاذب نظر تھا)۔ اس نے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی شخص ہو جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے! اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کیسی حماقت ہے کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔ آخر میں انسان ہوں۔ مجھے اس کا کلام سننا تو چاہیے۔ چنانچہ اس نے روئی اپنے کانوں سے نکال دی اور قرآن مجید کی آیات کو سناہ آیات قرآن سنتے ہی وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ یہی واقعہ نبی اکرمؐ کے ساتھ مدینہ کے لوگوں کی واقفیت کا موجب بن گیا۔ واپس آکر اس نے اہل مدینہ سے گفت و شنید کی جس کے نتیجہ میں انہوں نے نبی اکرمؐ سے متعدد خفیہ ملاقاتیں کیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض افراد مکہ آئےا ور طے پایا کہ زمانہ حج میں تشریق کی راتوں میں سے ایک رات یعنی بارہویں رات کو، جب سب سوئے ہوئے ہوں، یہ لوگ منیٰ میں عقبہ وسطیٰ میں موجود کسی گھاٹی میں جمع ہوں، نبی اکرمؐ بھی وہاں تشریف لائیں اور ان سے گفتگو کریں۔ اس ملاقات میں رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''میں تمہیں خدائے واحد کی جانب دعوت دیتا ہوں... اور اگر تم ایمان لانے پر آمادہ ہو تو میں تمہارے شہر میں آجائوں گا۔'' ان لوگوں نے آنحضرتؐ کی شرط کو قبول کیا اور مسلمان ہوگئے کیونکہ حضرت نے حقیقت ان پر تفصیل کے ساتھ واضح فرما دی تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ کی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی راہ ہموار ہوگئی۔ یہی سب سےپہلے واقعہ تھا۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ نے مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ بھیجا۔ جنہوں نے وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی۔ جو لوگ سب سے پہلے آئے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس بزرگ مبلغ کے ہاتھوں پر مزید بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے اور مدینہ میں تبلیغ اسلام کے لیے فضا ہموار ہوگئی۔

ادھر قریش نے بھی دن بدن سختی میں اضافہ کردیا حتیٰ کہ انہوں نے نبی اکرمؐ کا کام تمام کردینے کا عزم کرلیا (نعوذ باللہ!)۔ انہوں نے ''دارالندوہ'' میں ایک جلسہ کیا جس کی جانب اس آیہ مبارکہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ''دارالندوہ'' کو مکہ کی جلسہ گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مکہ میں اس زمانہ میں نہ تو بادشاہت کی صورت میں کوئی خودمختار حکومت قائم تھی، نہ ہی جمہوری حکومت تھی اور نہ ہی مکہ کسی دوسری حکومت کے تابع تھا۔ یہاں ایک طرح کی طوائف الملوکی حکم فرما تھی۔ طے پایا کہ ہر قبیلہ کے چند آدمی جو خاص شرائط کے حامل ہوں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی چالیس سال کی عمر سے کم نہ ہو، وہاں جمع کر درپیش مشکلات پر تبادلہ خیالات کریں۔ جو فیصلہ بھی وہاں کیا جائے

قریش کے سب لوگ اس پر عمل کریں۔ دارالندوہ مسجد الحرام کے قریب ایک کمرہ تھا۔ اب وہ کمرہ مسمار ہوکر مسجد الحرام میں شامل ہوچکا ہے۔

اس مکان میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ جیسے بھی بن پڑے محمد کی آزادی تبلیغ کو روکا جائے، ان کا کام ہی تمام کردیا جائے، انہیں محبوس کردیا جائے یا کم از کم انہیں جلاوطن کرکے ان کی جانب سے مطمئن ہوجانا چاہیے۔ پھر وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں روایت کرتے ہیں کہ اس مشورہ میں ایک بوڑھا (اجنبی) آدمی آن شامل ہوا ، حالانکہ طے یہ پایا تھا کہ قریش کے سوا کسی کو بھی اس محفل میں نہ آنے دیا جائے گا۔ اس بوڑھے نے کہا: ’’میں آپ حضرات کے زیر بحث موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ آخرکار اجازت پاکر وہ محفل میں داخل ہوگیا۔ روایات میں آیا ہے کہ یہ بوڑھا کوئی انسان نہ تھا بلکہ شیطان تھا جو بوڑھے آدمی کے بھیس میں تھا۔ بہرحال تاریخ میں وہ ’’شیخ نجدی‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔ اس محفل میں اس شیخ نجدی نے بھی اظہار خیال کیا اور آخرکار اسی کی رائے پر اتفاق کیا گیا۔ قریش کی یہ تجویز کہ کسی آدمی کو بھیج کر محمد کو قتل کروا دیا جائے، مسترد ہوگئی۔ اس شیخ نجدی نے کہا کہ یہ رائے قابل عمل نہیں۔ اس نے کہا: ’’اگر تم کسی ایک شخص کو بھیجو گے تو یقیناً بنی ہاشم خون محمد کے قصاص میں اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، اور کون ایسا شخص ہے جو اپنے قتل ہونے پر یقین کے باوجود اس کام کو انجام دینے پر تیار ہوگا۔‘‘ قریش کہنے لگے: ’’ہم انہیں قیدتنہائی میں ڈال دیتے ہیں۔‘‘ شیخ نجدی نے کہا: ’’یہ تجویز بھی مصلحت کے مطابق نہیں کیونکہ بنی ہاشم کو بہرحال یہ ناگوار گزرے گا کہ ان کا کوئی فرد محبوس ہو۔ اگرچہ وہ تنہا تو تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتے مگر ممکن ہے کہ حج کے موقع پر حج کے لیے آنے والے دوسرے لوگوں کی مدد حاصل کرکے محمد کو چھڑالے جائیں۔‘‘ اس کے بعد جلاوطنی کی تجویز پیش کی گئی۔ اس نے کہا: ’’یہ تو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ وجیہہ اور خوش کلام انسان ہیں۔ اب بھی وہ اس شہر میں تن تنہا تمہارے افراد کو یکے بعد دیگرے اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تم دیکھو گے کہ وہ عرب قبیلوں میں جاکر ہزاروں افراد کو اپنا پیروکار بنالیں گے اور کئی ہزار مسلح افراد کو ساتھ لے کر تم پر چڑھائی کردیں گے۔‘‘ آخرکار ایک ایسی تجویز پیش ہوئی جس سے اتفاق کرلیا گیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ ان کو قتل کردیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ قریش کے ہر قبیلے کاایک فرد اس میں شریک ہو ، بلکہ بنی ہاشم کا ایک شخص بھی اس میں شریک ہو (کیونکہ بنی ہاشم میں سے ابولہب اس محفل میں موجود تھا) اس طرح سب مل کر محمد کو قتل کردیں، پھر ان

کا خون بہا ادا کردیں۔ اگر اس صورت میں بنی ہاشم نے خون کا دعویٰ کیا تو ہم کہیں گے کہ تمہارا اپنا قبیلہ بھی تو اس میں شامل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہم ان کو دیت ادا کردیں گے۔ اگر وہ دس آدمیوں کی دیت کا بھی مطالبہ کریں گے تو ہم ان کو وہ بھی دے دیں گے۔

جس رات انہوں نے اس خفیہ فیصلے کو عملی جامہ پہنانا تھا، اسی رات نبی اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی، (وہی بات جو موسیٰؑ سے کہی گئی تھی یعنی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ (قصص:۲۰) (اے موسیٰؑ شہر کے بڑے بڑے آدمی تمہارے بارے میں مشورہ کررہے ہیں کہ تمہیں قتل کرڈالیں، پس تم (شہر سے) نکل بھاگو) وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ۰ۭ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللہُ۰ۭ وَاللہُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ۳۰ (انفال:۳۰) پس آپ مکہ سے چلے جائیں۔

قریش رات کے وقت حملہ کرنا چاہتے تھے۔ ابولہب، جو ان میں سے ایک تھا، اس تجویز میںمانع ہوا۔ اس نے کہا: ’’کسی کے گھر شبخون مارناصحیح نہیں۔ گھر میں عورتیں اور بچے ہیں۔ وہ ڈر جائیں گے یا مارے جائیں گے۔ ہمیں صبح تک صبر کرنا چاہیے۔‘‘ (ان میں بھی اس قدر مردانگی و شرافت پائی جاتی تھی۔) کہنے لگے ’’ٹھیک ہے!‘‘ انہوں نے نبی اکرمؐ کے خانہ اقدس کا محاصرہ کرلیا، پہر بٹھا دیا اور انتظار کرنے لگے کہ صبح ہو تو وہ نبی اکرمؐ پر حملہ کریں۔

اس بات پر تمام محدثین اور مورخین کا اتفاق ہے اور کسی نے بھی اس میں شک نہیں کیا ہے کہ پیغمبراکرمؐ نے حضرت علیؑ کو طلب کرکے فرمایا: ’’اے علیؑ! آج تمہیں میری خاطر فداکاری کرنا ہے۔‘‘ عرض کیا: ’’یارسول ؐ اللہ! آپ جیسا حکم کریں، میں حاضر ہوں۔‘‘ فرمایا: ’’آج رات تم میرے بستر پر سوجائو اور وہی چادر و بستر جسے میں ہر رات سوتے ہوئے استعمال کرتا ہوں، اوڑھ لو۔‘‘

امیرالمومنینؑ نے عرض کیا: ’’بہت خوب!‘‘ حضرت علیؑ اور ہند بن ابی ہالہ نے پہلے سے اس مقام یعنی غارثور کا پتا لگا لیا تھا جہاں رسول اکرمؐ کو جانا اور چھپنا تھا کیونکہ طےپایا تھا کہ جب تک آنحضرتؐ غار میں رہیں گے خفیہ طور پر آپؐ سے رابطہ برقرار رہے گا۔ یہ دونوں شخص آنحضرتؐ کی سواری کا انتظام بھی کریں گے، آپؐ کو خوراک بھی بہم پہنچائیں گے۔

بس رات کو حضرت علی آکر بستر رسول پر سوگئے اور پیغمبراکرم باہر تشریف لے گئے۔ جاتے ہوئے راستہ میں حضرت ابوبکرسے آنحضرت کی ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔

مکہ کے قریب ہی ایک غار ہے جس کو غارثور کہتے ہیں۔ یہ غارمکہ کے مغرب میں ایسی جگہ واقع ہے کہ اگر کوئی شخص مدینہ جانا چاہے تو یہ غار اس کے راستے میں نہیں پڑتا۔ لہٰذا لوگ اس راستہ کو چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرت حضرت ابوبکر کو اپنے ہمراہ لے کر اس غار میں چھپ گئے۔

ادھر قریش اس انتظار میں تھے کہ صبح ہو تو وہ سب یکبارگی آنحضرت پر حملہ کرکے آنحضرت پر چھریوں اور خنجر کے اتنے وار کریں (تلوار سے حملہ نہ کریں تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ ایک شخص نے آپ کو قتل کیا ہے) کہ آنحضرت قتل ہوجائیں۔ پھر اگر کوئی پوچھے کہ کس نے آپ کو قتل کیا ہے تو کہیں کہ ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا اور ہر ایک نے آپ پر وار کیا ہے۔ یہ لوگ خبردار تھے کہ آنحضرت گھر سے باہر نکلنے نہ پائیں لیکن صبح ہوئی تو اچانک کوئی شخص اٹھا تو اس نے دیکھا کہ یہ تو علی ہیں۔ حضرت علی کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگے: ’’این صاحبک‘‘ یعنی ’’تمہارا صاحب کہاں ہے؟‘‘ فرمایا: ’’کیا تم انہیں میرے سپرد کرگئے تھے کہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟‘‘ وہ کہنے لگے: ’’پھر وہ کیا ہوئے؟‘‘ فرمایا: ’’تم توانہیں جلاوطن کرنا ہی چاہتے تھے، وہ خود ہی اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔‘‘ اس پر وہ لوگ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے: ’’کیوں نہ ہم انہی پر حملہ کرکے ان کو قتل کر ڈالیں۔ اب وہ خود تو موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کے جانشین ہی کا کام تمام کیے دیتے ہیں‘‘ ان میں سے ایک نے کہا: ’’ان کو چھوڑ دو۔ یہ جوان ہیں اور ان کو محمد نے بہکا ہی دیا ہے۔‘‘ فرمایا: ’’خدا کی قسم! اگر دنیا کے سب لوگ پاگل ہوں اور ان میں میری عقل بانٹ دی جائے تو وہ سب عقلمند ہوجائیں گے۔ میں تم سب سے بڑھ کر عقل مند اور سمجھدار ہوں۔‘‘

کفار آنحضرت کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ آنحضرت کے قدموں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے غار تک پہنچ گئے، لیکن وہاں انہیں کوئی ایسی علامت نظر نہ آئی جس سے پتہ چلتا کہ حال ہی میں کوئی غار کے اندر گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں ایک مکڑی نے جالا تن رکھا ہے اور ایک پرندے کا آشیانہ ہے۔ کہنے لگے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی یہاں آیا ہو۔ وہ لوگ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے رسول اکرم اور حضرت ابوبکر برابر ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر بہت پریشان

ہوگئے، ان کا دل دھڑکنے لگا اور وہ خوف زدہ ہوگئے۔ یہ امر قرآن کی آیت کے مطابق ہے، کوئی حدیث و روایت نہیں کہ کہا جائے کہ اس کو فقط اہل تشیع صحیح تسلیم کرتے ہیں اور اہل تسنن اس کو نہیں مانتے۔ آیہ مبارکہ یہ ہے اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَـصَرَہُ اللہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْـنَیْنِ اِذْ ہُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا۰ۚ (توبہ:۴۰) اگر تم اس (رسولؐ) کی مدد نہ کرو گے تو (اللہ اس کا مددگار ہے) اس نے تو اپنے رسولؐ کی اس وقت مدد کی جب اس کو کفار (مکہ) نے نکال باہر کیا (اس وقت صرف دو آدمی تھے اور) دوسرے (رسولؐ) تھے۔ جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب اپنے ساتھی کو (اس کی گریہ وزاری پر) سمجھا رہے تھے کہ گھبرائو نہیں، اللہ یقیناً ہمارے ساتھ ہے۔ یعنی اگر تم قریش نبی اکرمؐ کی نصرت نہیں کروگے تو اللہ نے ان کی نصرت کردی اور وہ ان کی مدد کرتا ہی ہے جس طرح غار کے واقعہ میں ہجرت کی رات جب وہ دونوں غارمیں تھے، اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کی نصرت فرمائی تھی۔ ’’ھما‘‘ نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبراکرمؐ کے علاوہ ایک اور شخص بھی وہاں موجود تھا اور وہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا۰ۚ (عربی زبان میں صاحب کے معنی ہمراہی کے ہیں، حتیٰ کہ اگر کسی کے ساتھ حیوان بھی ہو تو عرب اس کو بھی ’’صاحب‘‘ ہی کہتے ہیں) اس وقت پیغمبراکرمؐ نے اپنے ہمراہی سے فرمایا: ’’ڈرونہیں، پریشان نہ ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔‘‘ فَاَنْزَلَ اللہُ سَكِيْنَتَہٗ عَلَيْہِ وَاَيَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْہَا (۸) ’’پس اللہ نے اپنی طرف سے ان پر تسکین نازل فرمائی۔ اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر سے ان کی مدد فرمائی جس کو تم لوگوں نے دیکھا تک نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبرؐ پر تسکین نازل فرمائی یہاں قرآن یہ نہیں کہتا کہ دونوں افراد پر تسکین نازل فرمائی۔ اللہ نے اپنی رحمت اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرمائی اور اس کی مدد کی۔ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ دونوں کی مدد کی۔ ہم اس مسئلے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ بہرحال آنحضرتؐ کا تعاقب کرنے والے افراد یہیں سے پلٹ گئے۔ کہنے لگے: ’’ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ وہ آسمان پر چڑھ گئے ہیں یا زمین کے نیچے چلے گئے ہیں؟‘‘ کچھ دیر تک تلاش کرتے رہے مگر کہیں انہیں نہ پاسکے۔ تین شبانہ روز یا اس سے بھی کچھ زیادہ مدت تک نبی اکرمؐ اسی غار میں رہے، جب رات چھا جاتی تو ہند بن ابی ہالہ جو حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ان کا بیٹا اور نہایت بزرگ آدمی تھا، تاریکی میں خفیہ طور پر انہیں کھانا پہنچا کر واپس چلا جاتا۔ دو سواریوں کے بہم پہنچانے کا مسئلہ پہلے طے ہوچکا تھا۔ ان کا بندوبست کیا گیا اور رات کے وقت انہیں غار کے پاس لے گئے جہاں وہ دونوں ان پر سوار ہوکر مدینے کی جانب روانہ ہوگئے۔

اب قرآن کہہ رہا ہے کہ تم نے ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کن کٹھن مراحل میں کس طرح اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ انہوں نے منصوبہ باندھا، غور کیا اور طریق کار وضع کیا مگر نہیں جانتے تھے کہ خدا کی اگر تدبیر کرنا چاہے تو اس کی تدبیر سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (انفال:۳۰) یعنی جب کفار تمہارے بارے میں تدبیر کررہے تھے کہ تمہارے ساتھ ان تین میں سے کوئی ایک سلوک کریں۔ لِيُثْبِتُوْكَ یعنی ’’اثبات‘‘ جس کے معنی ’’حبس‘‘ کے ہیں، کیونکہ جب کسی کو محبوس کرتے ہیں تو اسے کسی جگہ ساکن رکھتے ہیں۔ عرب اس کو کہتے ہیں اثبت یعنی اس کو محبوس کرو تاکہ اسے کسی ایک جگہ ساکن رکھ کر اس کی نگرانی کریں یعنی اسے قید رکھیں۔ اَوْ يَقْتُلُوْكَ یا آپ کو قتل کردیں، اَوْ يُخْرِجُوْكَ۰ۭ یا آپ کو جلاوطن کردیں۔ وَيَمْكُرُوْنَ وہ یہی تدبیریں کررہے تھے۔ قریش اپنی تدبیروں پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے کہ ہم فلاں طریقہ سے ان کو قتل کردیں مگر نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور تدبیر ان تمام تدبیروں اور منصوبوں سے بالاتر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت کسی بندہ کے شامل حال ہوجائے تو پھر کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑسکتی۔

’’مکر‘‘ اس منصوبہ کو کہتے ہیں جس کا مقصد واضح نہ ہو۔ یعنی انسان کوئی منصوبہ بنائے جس سے کسی خاص مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہو جب کہ دوسرے لوگ اس منصوبہ سے آگاہ ہوتے ہوئے اپنے ذہن میں اس کا مقصد مختلف جانتے ہیں تو اس کو ’’مکر‘‘ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی بعض اوقات واقعات کو اس طرح وجود میں لاتا ہے کہ انسان نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کس مقصد کے پیش نظر رونما ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں مقصد مختلف ہوتا ہے۔ مگر آخر میں اس واقعہ کا کچھ اور ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اس سےپتہ چلتا ہے کہ اللہ بھی ’’مکر‘‘ یعنی تدبیر فرماتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے واقعات وجود میں لاتا ہے جن کا ظاہر ہدف مخفی سے مختلف ہوتا ہے۔ پس وہ تدبیریں کرتے ہیں جبکہ اللہ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تمام تدبیر کرنے والوں سے بہتروبالا ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ۰ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۳۱ (انفال:۳۱)یعنی اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا تو (لیکن) اگر ہم چاہیں تو یقیناً ایسا ہی (قرآن) ہم بھی کہہ سکتے ہیں، یہ تو بس اگلوں ہی کے قصے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پیغمبراکرم کا وسیلہ، آنحضرت کا معجزہ سب کچھ حضرت موسیٰ کے عصا کے مانند ہی تھا، اور یہ قرآن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قرآن کے سوا آنحضرت کا کوئی ناصرومددگار نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر ایک شخص تن تنہا مبعوث ہوتا ہے اور قرآن کے ذریعہ لوگوں کو درجہ بدرجہ اکٹھا کرکے ایک

طاقت وجود میں لاتا ہے۔ اسی لیے پیغمبراکرمؐ کے حوالہ سے جس مسئلےکو اٹھایا گیا وہ مسئلہ قرآن ہی تھا۔ قریش پیغمبراکرمؐ کے اس وسیلہ کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھے۔ آنحضرتؐ فرما رہے تھے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے اور انسانی کلام سے بالاتر ہے۔ کفار کو اس دلیل کا جواب دینا چاہیے تھا۔ قرآن کے حوالہ سے جو موضوعات بالخصوص زیربحث تھے ان میں قرآن کی اور زیبائی فصاحت و بلاغت کا موضوع بھی شامل تھا جبکہ دوسرا موضوع سابقہ انبیا کے واقعات تھے جو نبی اکرمؐ بتاتے اور قریش جن سے بالکل بے خبر تھے۔ نبی اکرمؐ کا مقابلہ کرنے کے لیے بعض اوقات قریش کے شیوخ و عمائد دعویٰ تو کرتے مگر کبھی بھی اسے عملی جامہ نہ پہنا سکتے۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا یعنی جب ہماری آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ ہٰذَآ۰ۙ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کے مانند کہہ سکتے ہیں لیکن ہم کہنا نہیں چاہتے۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے کیونکہ اگر تم کہہ سکتے تو پہلے لمحہ میں ہی کہہ دیتے۔

ہمارے والد محترم فرمایا کرتے تھے کہ ایک ’’ماہرمعمار‘‘ تھا اگرچہ آج کی اصطلاح میں وہ نام نہاد معمار ہی تھا۔ ایک مرتبہ اسے لایا گیا کہ اینٹیں چن کر ہمارے گھر کی چھت تیار کردے۔ کہتے ہیں کہ وہ آیا اور اس نے چھت تیار کی۔ جب چھت مکمل ہونے کے قریب پہنچی تو دفعتاً زمین پر آگری۔ ہم نے سوچا کہ کوئی بات نہیں پہلی بار ہے، اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ اس نے ان تمام اینٹوں کو اکٹھا کیا اور پھر چھت بنانے لگا۔ دوسری مرتبہ پھر چھت زمین پر آرہی۔ تیسری مرتبہ بھی یہی کچھ ہوا۔ ہمارے والد محترم نے خفا ہوکر کہا: ’’برخوردار! جب تم یہ کام نہیں جانتے ہو تو پھر اوروں کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ پہلے دن ہی کہہ دیتے کہ مجھے چھت بنانا نہیں آتا۔ تم نے خود کو بھی پریشان کیا اور ہمیں بھی، بہتر تھا کہ کہہ دیتے میں یہ کام نہیں جانتا۔‘‘ وہ کہنے لگا: ’’جناب! آپ یہ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ اگر میرا دل چاہے تو میں چھت بنا سکتا ہوں۔‘‘ میں نہیں جانتا کہ اس کا دل کب اس کام کے کرنے پر آمادہ ہوگا!

اسی طرح انہوں نے بھی کہا کہ اگر ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام کہہ سکتے ہیں مگر ہم ابھی کہنا نہیں چاہتے۔ یہ بات وہ صرف کمزوروں اور بے بس لوگوں کو فریب دینے کے لیے کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر محمدؐ کہتے ہی کیا ہیں؟ ماضی کے قصے اور داستانیں ہی تو بیان کرتے ہیں۔ ہم بھی ماضی کے قصے بیان کرسکتے ہیں۔ ان میں نضربن الحارث نامی ایک شخص اسی مقصد کے پیش نظر ایران گیا (قریش کے سرکردہ افراد کے ایران سے بھی تعلقات تھے)۔ اس نے رستم و اسفند یاروکیکائوس و جمشید

وغیرہ جیسے بہت سے قدیم ایرانی قصے اکٹھے کیے اور کہنے لگا: ’’اے لوگو! آئو میں تمہیں قصہ سنائوں۔ اگر محمد تمہیں داستانیں سناتے ہیں تو آئو میں بھی تمہیں داستانیں سناتا ہوں۔‘‘

مگر کسی نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا، کیونکہ قرآن میں مندرج واقعات قصے اور افسانے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا: لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ ھٰذَآ۰ۙ یعنی ہم چاہتے ہی نہیں ہیں، لیکن اگر ہم چاہیں تو ایسی داستانیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں، یہ تو بس سابقین کے قصے ہیں اور ان کے قصے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

تیسری تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قَالُوا اللّٰہُمَّ اِنْ كَانَ ہٰذَا ہُوَالْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝۳۲

اور (اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب (ان کافروں نے) دعائیں مانگی تھیں کہ خداوندا اگر یہ (دین اسلام) حق ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب ہی نازل فرما۔ سورہ انفال

قرآن افکار کی تصویرکشی کرتا ہے۔ لوگ اپنے جن جملوں کی وضاحت نہیں کرپاتے، قرآن ان کو واضح فرما دیتا ہے: اللّٰہُمَّ اِنْ كَانَ ہٰذَا ہُوَالْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یعنی خداوندا! اگر یہ (دین اسلام) حق ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب ہی نازل فرما۔

یعنی خدایا اگر حق یہی ہے، سچی بات اور قرآن جس کا یہ پیغمبرؐ مدعی ہے، یہی ہے، اگر یہ درست ہے، یہ پیغمبرؐ راست گو ہے اور جو کچھ کہتا ہےوہ تیری جانب سے ہے (ایسے موقع پر توقع ہوتی ہے کہ اس کے بعد کہنے والا کہے گا تو پھر ہم اسے تسلیم کرتے ہیں، یا یہ کہ خدایا اسے ہم پر ظاہر فرما دے۔ جویائے حقیقت انسان تو یہی کہتا ہے، مگر اس نے کہا کہ اگر ایسا ہے) تو آسمان سے پتھر ہم پر نازل کرکے ہمیں تباہ کردے، یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر نازل کرہ میں اس حقیقت کو سننے کی تاب نہیں رکھتا۔ اگر حق و حقیقت یہی ہے تو فوراً مجھ پر آسمان سے پتھر مار دے تاکہ میں ایسا دن نہ دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ حقیقت وہ ہو جو میں چاہتا ہوں، اور اگر حقیقت میری مرضی کے مطابق نہ ہو تو میں اس سے بیزار ہوں۔

قرآن نے ان کی قلبی کیفیت کو بیان فرمایا ہے مگر کیا دنیا میں فقط وہی لوگ ایسے تھے؟ ہمیں اپنے بارے میں خوش فہمی میںمبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مسلم ہے کہ حقیقت کے سامنے کامل طور پر سرتسلیم خم کردینے کی کیفیت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ حضرت امیرالمومنینؑ سے اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: الاسلام هو التسلیم لیکن کس کے سامنے یا کس شخص کے سامنے؟ کسی چیز کے سامنے نہیں، نہ کسی شخص کے سامنے، بلکہ

حق کے سامنے سرتسلیم خم کرنا اسلام ہے، یعنی جب کسی شخص کا حق سے سامنا ہو تو پھر اس کے اندر سرکشی و خودسری کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو۔ اصول دین اور فروع دین میں یہی فرق ہے کہ فروع دین ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر انسان کو عمل کرنا لازم ہے جبکہ اصول دین کا علم و یقین ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا اصول دین کے سلسلہ میں علم و یقین کافی ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ البتہ یقین و علم لازم ہے کیونکہ جب تک عقل کسی چیز کو سمجھ نہ لے اسے تسلیم نہیں کرسکتی۔ اصول دین کے سلسلہ میں یقین کے علاوہ انہیں تسلیم کرنا بھی لازم ہے یعنی ان سے سرکشی نہ ہو۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں سرکشی کا جذبہ بالکل نہ پایا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے تو مجھے مارڈالو، تو وہ باایمان نہیں کیونکہ ایمان یہ ہے کہ انسان سچائی کے سامنے سرتسلیم خم کردے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کافر ہے یا مومن؟ یقیناً کافر ہے۔ کیا وہ اللہ پر یقین رکھتا تھا؟ ہاں، علم رکھتا تھا بلکہ اس کا یقین ہم سے بہتر تھا۔ اللہ کے حضور کہتا ہے: ''تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کرکے دم لوں گا'' فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّہُمْ اَجْمَعِيْنَ(١٠) یہ بھی کہتا ہے رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ(١١) یعنی پروردگار مجھے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت عطا فرما۔ گویا اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ لیکن صرف اعتقاد علم رکھنا ایمان کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ انسان کو چاہیے کہ جس چیز کا اسے یقین ہو اس کے سامنے تسلیم کرے۔ وَجَحَدُوْا بِہَا وَاسْتَيْقَنَتْہَآ اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا۰ۭ(١٢) یعنی ان کے دلوں کو یقین تھا (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے) اس کے باوجود سرکشی و تکبر کے باعث انکار کرتے تھے۔

دراصل ہمیں اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔ اگر ہم اس حقیقت کا انکار کرتے ہوں جس کو جانتے بوجھتے ہوں تو اس صورت میں ہم کافر ہوں گے، مومن نہیں۔ کسی بات کا علم حاصل کرلینا ہی انسان کے مومن ہونے کے لیے کافی نہیں، بلکہ انسان اس کے ساتھ ساتھ سرکش و نافرمان بھی نہ ہو۔

اس وقت کو یاد کرو جب وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم اس حقیقت کے مشاہدہ کی طاقت نہیںرکھتے۔ وَمَا كَانَ اللہُ لِيُعَذِّبَہُمْ وَاَنْتَ فِيْہِمْ۰ۭ وَمَا كَانَ اللہُ مُعَذِّبَہُمْ وَہُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۳۳ (انفال:٣٣) ایسا نہیں ہے کہ اللہ ان لوگوں پر عذاب کرے جبکہ آپ ان کے درمیان موجود ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ اللہ ان پر عذاب نازل کرے در آں حالیکہ وہ گناہگار ہوں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہوں۔

نہج البلاغہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''اللہ کے دو مقامات امان ہیں، ایک جناب رسولؐ خدا اور دوسرے استغفارہ اے لوگو! ایک امان تمہارے درمیان سے

اٹھ گئی، دوسری امان کو اپنے درمیان محفوظ رکھو۔‘‘

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عذاب سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کی اصطلاح میں عذاب دو طرح کے ہیں۔ ۱۔ استیصال، ۲۔ غیراستیصال۔ پہلی قسم میں غیرمعمولی عذاب مثلاً صاعقہ، ہوا اور مسخ وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں عذاب کا لفظ وارد ہوا ہے جس سے مذکورہ عذاب مراد نہیں ہیں بلکہ اور طرح کے عذاب مراد ہیں، مثلاً ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوم پر مسلط ہوگئی جو اول الذکر کے ہاتھوں ذلیل ہوئی۔ سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے: قُلْ ہُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓي اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۰ یعنی کہہ دیجیے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے تم پر عذاب نازل فرمائے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے تمہیں عذاب میں مبتلا کرے، یا تم کو فرقوں میں متفرق کردے، یا ایک دوسرے کے ہاتھوں ایذا پہنچائے۔ اوپر سے عذاب نازل کرنے سے مراد یہ ہے کہ صاحبان قوی تر کو تم پر مسلط کردے، قدموں کے نیچے سے عذاب سے دوچار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے ماتحتوں کے زیرتسلط آجائو۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: قَاتِلُوْہُمْ يُعَذِّبْہُمُ اللہُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِہِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْہِمْ یعنی تم کفار سے جنگ کرو کہ اللہ تمہارے ہاتھوں ان پر عذاب نازل فرمائے، ان کو ذلیل کرے اور تمہیں ان پر مسلط فرما دے۔

زیربحث آیت سے مراد یہ ہے کہ جب تک پیغمبرؐاکرم تمہارے درمیان ہیں تمہارے لیے استغفار کرتےہیں، اللہ تم پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ کیا اس عذاب سے ایسا عذاب مراد ہے جیسا قوم لوطؑ پر نازل کیا گیا، یا اس سے کوئی اور عذاب مثلاً سختیاں وغیرہ مراد ہیں؟ بظاہر یہاں دونوں طرح کے عذاب مراد ہیں۔ پھر کیا اس سے یہ مراد ہے کہ نبی اکرمؐ جسمانی طور پر لوگوں کے درمیان موجود ہوں؟ بظاہر تو یہی ہے، تاہم بعید نہیں کہ اس سے نبی اکرمؐ کی سنت، احکام اور تعلیمات مراد ہوں۔ اس صورت میں آیہ مبارکہ کے معنی یہ ہوں گے: ’’جب تک تم ان کے درمیان ہو، یعنی جب تک تمہاری تعلیمات اور تمہارے احکام ان کے درمیان ہوں... یا جب تک تم میں توبہ، نیکی کی طرف بازگشت اور ندامت کی صفت موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ تم کو عذاب سے دوچار نہیں فرمائے گا۔ بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ امت اسلامی عادوثمود پر نازل ہونے والے عذابوں سے امان میں بھی رہے تو دیگر عذابوں سے امان میں نہیں ہے۔ پیغمبراکرمؐ کی رحلت کے فوراً بعد اس ملت پر غیرمحسوس عذاب نازل ہوا۔ قرآن اس طرح کے مختلف عذابوں کو ذکر فرماتا ہے، مثلاً کمزوروں پر صاحبان عذاب اقتدار کا مسلط ہوجانا۔ سب سے بڑھ کر فرقہ واریت ہے جس سے امت آپس میں دست و گریبان

ہوجائے اور دشمن ان کی حالت سے خوش ہوں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے عذاب کی اقسام ہیں۔ وَمَا كَانَ اللہُ لِيُعَذِّبَہُمْ وَاَنْتَ فِيْہِمْ۰ یعنی جب تک آپ ان کے درمیان ہیں، اللہ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ مزیدبرآں استغفار و توبہ کرنے کی صورت میں بھی اللہ ان کو عذاب سے دوچار نہیں فرمائے گا۔

وَمَا لَہُمْ اَلَّا يُعَذِّبَہُمُ اللہُ وَہُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَاۗءَہٗ۰ اِنْ اَوْلِيَاۗؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (انفال:۳۴) اور جب یہ لوگ لوگوں کو مسجدالحرام (خانہ کعبہ میں عبادت) سے روکتے ہیں تو پھر ان کے لیے کون سی بات باقی ہے کہ ان پر عذاب نازل نہ فرمائے اور یہ لوگ خانہ کعبہ کے متولی بھی نہیں (پھر کیوں روکتے ہیں) اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں۔

یہ آیت خاص طور پر قریش کی طرف اشارہ کررہی ہے اور قریش سے بعد کے لوگوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ قریش عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ لوگوں کو مسجدالحرام میں آنے جانے سے روکتے ہیں اور اپنے آپ کو مسجدالحرام کے وارث و متولی جانتے ہیں۔ قریش اپنے آپ کو مسجدالحرام کے وارث اور متولی گردانتے تھے، کہتے تھے کہ کعبہ ہماری ملکیت ہے چنانچہ جسے چاہتے وہاں جانے دیتے، جسے چاہتے روک دیتے۔ چونکہ یہ مکہ میں رہتےتھے اس لیے مکہ کے گھروں اور زمینوں کو اپنی ملکیت جانتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس سوچ کی مخالفت کی، فرمایا کہ قیامت تک کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ وہ مسجدالحرام و کعبہ پر اختیار رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تمام صاحبان تقویٰ اور مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ سورہ حج کی ایک آیت ہے: سَوَاۗءَۨ الْعَاكِفُ فِيْہِ وَالْبَادِ۰ یعنی مکہ کے باشندے اور باہر سے آنے والے سب مساوی ہیں۔

مکہ کے رہائشی مکانوںکے حوالہ سے ایک مشکل ان کا کرایہ ہے اور وہ بھی بہت زیادہ کرایہ۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ کرایہ لینے کا حق رکھتے ہیں، جبکہ اہل سنت کی فقہ میں بھی ایسا نہیں ہے۔ نہج البلاغہ میں ایک خط ہے جو امیرالمومنین نے قثم ابن عباس کو اس وقت لکھا تھا جب وہ آپ کی جانب سے مکہ کے حاکم تھے۔ آپ اس میں تحریر فرماتے ہیں مرا هل مکۃ الا یاخذوا من ساکن اجرا اہل مکہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ وہاں آکر ٹھہرنے والوں سے کرایہ وصول کریں کیونکہ مکہ اوقاف میں شامل ہے۔ انہیں کسی کو مکہ میں آنے سے روکنے کا حق بھی حاصل نہیں۔ نبی اکرم نے حکم دیا تھا کہ دو کواڑوں والے دروازے لگائے جائیں۔ لہٰذا مکہ دنیابھر کے مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اور کسی کو بھی اس شہر میں آنے والوں پر اعتراض کا حق نہیں۔

وَمَا لَہُمْ اَلّا یُعَذِّبَہُمُ اللہُ وَہُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (انفال:۳۴) وہ لوگوں کی راہ روکتے اور اپنے آپ کو اس کا متولی جانتے ہیں۔ وَمَا کَانُوْا اَوْلِیَآءَہٗ۰ۭ اس بات میں بالکل اختیار نہیں رکھتے۔ اِنْ اَوْلِیَاۗؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اس کا اختیار صرف صاحبان تقویٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَہُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ان میں سے اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ صدراسلام میں مسجدالحرام اتنی وسیع نہیں تھی جتنی اب ہم اسے پاتے ہیں۔ اس وقت کعبہ اور مسجدالحرام کا درمیانی فاصلہ پندرہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ مسجدالحرام کا رقبہ ۳۲x۳۲ میٹر تھا اور کعبہ کا عرض ۴میٹر اور طول اس سے کچھ زیادہ تھا۔ صدراسلام میں خانہ کعبہ کے چاروں طرف کے گھروں کو خرید کر مسجدالحرام میں توسیع کی گئی۔ تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے زمانہ میں اس میں مزید توسیع کا فیصلہ کیا گیا۔ مسلمان خلفا کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں کے گھر ان سے زبردستی حاصل نہ کریں کیونکہ بعض اس کو ایک طرح کا غصب قرار دیتے تھے۔ خلیفہ مہدی مسجدالحرام میں توسیع کرنا چاہتا تھا۔ بعض لوگوں نے اپنے گھر فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ اہل سنت کے بعض فقہا نے فتویٰ دیا کہ چونکہ وہ اپنے گھروں کے مالک ہیں لہٰذا اگر وہ چاہیں تو بیچیں اور نہ چاہیں تو نہ بیچیں، جبکہ بعض فقہا نے فتویٰ دیا کہ یہ مسجدالحرام ہے، اس لیے ان کے گھر زبردستی بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ عام طور پر جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آئمہ معصومین کی جانب رجوع کیا جاتا۔ حضرت امام محمدباقرعلیہ السلام نے اس سلسلہ میں عجیب دلیل پیش فرمائی۔ آپ نے ثابت کیا کہ چونکہ مسجدالحرام کا مسئلہ ہے، اس لیے اگر مسجدالحرام کی مصلحت اس بات کا تقاضا کرے تو گھر کے مالک کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ فرمایا کہ کیا پہلے کعبہ بنایا گیا تھا اور بعد میں لوگ کعبہ کی وجہ سے یہاں آئے تھے یا پہلے لوگ یہاں آئے تھے اور بعد میں انہوں نے کعبہ تعمیر کیا تھا؟ یعنی کیا ایسا تھا کہ لوگ پہلے آئے گھروں کے نقشے بنائے پھر گھر تعمیر کرکے زمین کا کچھ حصہ مسجد کے لیے وقف کیا۔ کیا لوگ پہلے زمین کے مالک بنتے ہیں اور پھر اس میں کچھ حصہ مسجد کے لیے مختص کرتے ہیں؟ ایسی صورت میں مسجد عبد میں بنتی ہے۔ دنیا کی تمام مساجد ایسی ہی ہیں۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی کی بھی یہی صورت ہے۔ ساری دنیا میں فقط ایک ہی مقام ایسا ہے جہاں پہلے مسجد بنی اور پھر مسجدنے اس سرزمین کو آباد کیا، وہ ہے سرزمین مکہ، کیونکہ سرزمین مکہ بے آب و گیاہ تھی، اس کا کوئی مالک نہ تھا۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے وہاں لوگوں کے لیے کعبہ بنایا اور اسے عبادت کے لیے مختص کردیا تاکہ تاقیام قیامت لوگ وہاں آکر عبادت کریں۔ لہٰذا سب سے پہلے حضرت ابراہیم تشریف لائے اور انہوں نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد لوگ وہاں آکر آباد ہوئے۔ پس خانہ کعبہ اور مسجدالحرام کا حق محفوظ ہے۔ لوگ وہاں تک اس سرزمین کے مالک بن سکتے ہیں جہاں تک خانہ کعبہ اور مسجدالحرام کے سدراہ نہ ہوں اس حد کے

باہر وہ ملکیت میں آزاد ہیں۔ جب حضرت امام محمدباقر نے یہ دلیل پیش کی تو سب نے اس سے اتفاق کیا۔

مکہ کی سرزمین امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ قرآن بھی اسی منطق کو بیان فرماتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہیں، دنیابرھ کے متقی مسجدالحرام کے متولی ہیں۔ یہ ایسا جرم ہے جس کا تعلق ساری دنیا کے مسلمانوں اور متقیوں سے ہے۔

بعد والی آیت: وَمَا كَانَ صَلَاتُہُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَۃً ۰ (انفال:۳۵) یہ آیت سابقہ آیہ مبارکہ کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ قرآن بتلاتا ہے کہ اپنے آپ کو کعبہ کے متولی سمجھنے والے ان اختیار بدست لوگوں نے کعبہ کے ساتھ کیا کیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر خانہ کعبہ تعمیر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں فرمایا کہ میرے گھر کو توحید اور خدائے واحد کی عبادت کے پیش نظر اس کا طواف کرنے والوں کے لیے پاک کیجیے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰہٖمَ مُصَلًّى۰ یعنی حکم دیا گیا کہ مقام ابراہیم کو مقام عبادت قرار دوایک کام جو وہاں انجام دیا جانا چاہیے تھا وہ نماز تھی۔ انہوں نے نماز میں اس قدر کانٹ چھانٹ سے کام لیا اور اپنی جانب سے اس میں اس قدر اضافہ کیا کہ نماز سیٹی اور تالیاں بجانے میں تبدیل ہوکر رہ گئی، حالانکہ عبادتیں توقیفی ہوتی ہیں، یعنی عبادت میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اپنی مرضی سے کمی بیشی نہیں کی جانی چاہیے، بلکہ جس طرح ہمیں بتائی گئی ہے ویسے ہی کم و بیش کیے بغیر اسے انجام دیا جائے۔ اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ کہ اگر بعض لوگ عربی میں پڑھیں، بعض فارسی میں، بعض ترکی میں، الغرض ہر کوئی اپنی قومی زبان میں پڑھے تو یہ من مانی ہوگی یا ہمارا یہ کہنا کہ سفر کے دوران قدیم زمانہ میں نمازقصر پڑھی جاتی تھی۔ مگر اب چونکہ ہوائی جہاز پر سفر کیا جاتا ہے، اس لیے اب پوری نماز واجب ہونی چاہیے کیونکہ اب سفر میں مشقت پیش نہیں آتی۔ پس اگر عبادات میں من مانی کی جائے تو تدریجاً ان کی شکل تبدیل ہوجائے گی اور وہ اس شعر کی مصداق بن جائیں گی

بس کی بہ بستند بر ا و برگ و ساز

گر تو بینی نہ شناسیش باز

(انہوں نے اس قدر اس میں اضافہ کیا ہے کہ اگر تم دوبارہ اسے دیکھو تو پہچان نہ پائو گے)

جس نماز کو وہ سیٹی بجانے کی شکل میں پڑھتے تھے وہ اس صورت میں یکدم تو تبدیل نہیں ہوئی تھی، بلکہ انہوں نے پہلے اس کے ایک حصہ کو بدلا، پھر دوسرے حصے کو، یہ سلسلہ یونہی جاری رہا اور کئی پشتوں کے گزرنے کے بعد نماز ایسی صورت میں بدل گئی کیونکہ کوئی نسل بھی اپنے سے پہلے کی نسل کے طریقہ نماز کےبارے میں کچھ نہ جانتی، بلکہ خیال کرتی کہ جو اسے اس نسل سے ملا ہے شروع سے ایسا ہی تھا۔ لہٰذا کئی پشتوں کے گزرجانے کے بعد ایسا روپ دھار لیتی ہے جو اصلی کے ساتھ بالکل شباہت نہیں رکھتا۔

قرآن اور نماز، مثلاً فارسی زبان میں پڑھے جانے کے حوالہ سے اس تجربے کو بیان کرنا بے فائدہ معلوم نہیں ہوتا جو غیرملکیوں نے ایک ہی جملہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے حاصل کیا ہے۔ فرض کیجیے فارسی زبان کے کسی جملہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے پھر عربی سے ترکی میں، پھر ترکی سے انگریزی میں، پھر انگریزی سے فرانسیسی میں، پھر فرانسیسی سے جرمن زبان میں اور پھر جرمن زبان سے روسی زبان میں حتیٰ کہ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے... یہ تجربہ کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چالیسویں ترجمہ میں ذرہ برابر بھی پہلے جملے میں سے باقی نہ رہا۔

ممکن ہے آپ پوچھیں کہ بعض احکام پر انسان کو جانتے ہوئے یا بے سمجھے بوجھے کیوں عمل پیرا ہونا چاہیے، مثلاً نماز ظہر کو آہستہ آواز میں پڑھنے کا مسئلہ ہے۔ اس کا بھی ایک فلسفہ ہے۔ اس بارے میں غوروفکر ضرور کیجیے، مگر ہر وقت یہی نہ سوچتے رہیں کہ اس کام کو اسی فلسفہ کے مطابق انجام نہ دیں، بلکہ یوں کہیں میں اس کام کو بجالاتا ہوں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیم تالیاں بجا کر نماز نہیںبجالاتے تھے، بلکہ نماز نے یہ شکل رفتہ رفتہ اختیار کرلی تھی۔ قرآن مجید کے مطابق کعبہ کے ان متولیوں کا طریقہ نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ لوگ حق و حقیقت کا انکار کرنے کے بموجب اللہ کا عذاب چکھیں گے!

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

چوتھی تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللہِ۰ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَہَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْہِمْ حَسْـرَۃً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ۰ۥۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَہَنَّمَ يُحْشَــرُوْنَ۝۳۶ۙ لِيَمِيْزَ اللہُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَہٗ عَلٰي بَعْضٍ فَيَرْكُمَہٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَہٗ فِيْ جَہَنَّمَ۰ۭ اُولٰۗىِٕكَ ہُمُ الْخٰسِـــرُوْنَ۝۳۷ۧ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَہُوْا يُغْفَرْ لَہُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۰ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِيْنَ۝۳۸

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا یہ اپنے اموال کو صرف اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکیں تو یہ خرچ بھی کریں گے اور اس کے بعدیہ بات ان کے لئے حسرت بھی بنے گی اور آخر میں مغلوب بھی ہوجائیں گے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا یہ سب جہنّم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ تاکہ خدا خبیث کو پاکیزہ سے الگ کردے اور پھر خبیث کو ایک پر ایک رکھ کر ڈھیر بنا دے اور سب کو اکٹھا جہنّم میں جھونک دے کہ یہی لوگ خسارہ اور گھاٹے والے ہیں۔ پیغمبر آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ اپنے کفر سے باز آجائیں تو ان کے گزشتہ گناہ معاف کردئیے جائیں گے لیکن اگر پھر پلٹ گئے تو گزشتہ لوگوں کا طریقہ بھی گزر چکا ہے۔

قرآن کریم کا دستور اور روش یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ہرگز مغرور نہیں ہونے دیتا۔ یعنی وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ تمہارا اسی قدر ایمان لے آنا اور اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کردینا کافی ہے، اب اطمینان رکھو کہ تمام کام صحیح ہوگئے ہیں۔ اسی طرح قرآن، باطل کی قوت کو بھی نظرانداز نہیں کرتا بلکہ اسے ہمیشہ سامنے رکھتا ہے، اس طرح کہ اہل حق اور اہل باطل کی جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر اہل حق راہ حق پر ثابت قدم رہیں تو کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ پس اہل باطل اور اہل حق کے درمیان جنگ برابر جاری ہے۔ لہٰذا اہل حق کو یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا ایمان لے آنا اور حق سے وابستہ ہوجانا ہی ان کے لیے کافی ہے، بلکہ انہیں میدان جنگ میں کود پڑنا چاہیے اور یقین کرلینا چاہیے کہ اگر وہ حق کی راہ پر ثابت قدم رہیں گے تو کامیابی انہی کی ہوگی۔

میں نے جن آیات کی تلاوت کی ہے، اب ان کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتا ہوں تاکہ آپ دیکھ لیں کہ قرآن بھی اسی منظر کی تصویرکشی کرتا ہے یا نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللہِ۰۝۰ (انفال:۳۶) یقیناً کفار جو تمہارے مخالفین ہیں، تمہارا مقابلہ اور حق کا راستہ مسدود کرنے کے لیے اپنی دولت خرچ کرتے ہیں۔ ''انفاق'' کے معنی کسی مقصدوہدف کے حصول کے لیے دولت خرچ کرنے کے ہیں۔ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں یعنی کافر انفاق کرتے ہیں۔ لیکن تمام انفاق خدا کے راستے میں نہیں ہوتے، بعض انفاق باطل کے راہ میں بھی کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی دولت اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ اس راستے کو مسدود کر دیں جو پیغمبراکرم نے کھولا تھا اور تم جس پر گامزن ہو۔ وہ اس چشمہ کو دہانہ ہی پر خشک کردینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن تاکید فرماتا ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں، اس کا تعلق فقط ماضی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مستقبل میں بھی ایسے واقعات رونما ہوں گے جب کفار راہ خدا کو مسدود کرنے کے لیے دولت خرچ کریں گے۔ فَسَیُنْفِقُوْنَہَا (حرف ''س'' جو فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے) یعنی مستقبل قریب میں وہ اس راہ میں اپنی دولت خرچ کریں گے۔ مگر اس کا قطعی نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا انہیں اس طرح اپنی دولت خرچ کرنے کا کچھ فائدہ بھی ہوگا اور کچھ کامیابی بھی حاصل ہوگی؟ ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْہِمْ حَسْـرَۃً (ہرگز نہیں!) ان کے دلوں میں اس بات کا صرف افسوس ہی رہے گا کہ ہم نے اتنی دولت بھی خرچ کی لیکن مقصد پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ ایک مومن کے راہ خدا میں دولت خرچ کرنے میں بس یہی فرق ہے، اس دولت سے جو کافر راہ خدا کو مسدود کرنے کے لیے صرف کرتا ہے۔ مومن کبھی کف افسوس نہیں ملتا خواہ اس راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مقصد حاصل ہو یا نہ ہو البتہ مومن کو اپنی دولت ایسے راستے میں خرچ کرنی چاہیے جس سے مقصد حاصل ہوسکتا ہو، اس شخص کی طرح خرچ نہیں کرنا چاہیے کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنی دولت جو فلاں راستے میں دے رہے ہو اور بقول اپنے تم اسے بھلائی کے راستے میں دے رہے ہو، تو کس کے لیے دے رہے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ میں تو دے رہا ہوں، باقی وہ خود ذمہ دار ہے بے شک جائے جہنم میں، میری بلا سے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ تم معترض بھی جہنم ہی میں جائو گے۔ تم جو ایسے شخص کو دولت دے رہے ہو جس پر تمہیں اعتماد ہی نہیں نہ جانتے ہو کہ یہ دولت کس راہ میں خرچ ہوگی، کیا اسلام کو اس سے کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں، عذاب کے مستحق ہو وہ جواب میں کہتا ہے کہ میرا ان باتوں سے کیا تعلق! مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے، وہ جہنم میں جاتا ہے تو جائے۔ نہیں،

ایسا نہیں! تم اسلام اور اللہ کے نام پر دولت دے رہے ہو، مگر چونکہ یہ دولت ایسے اشخاص کو مل رہی ہے، یا ان کاموں میں خرچ ہورہی ہے جن سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے، اس لیے تم بھی جہنم ہی میں جاؤ گے۔ البتہ اگر کوئی مومن اپنا ماہ راہ حق میں خرچ کرنے کی اس قدر کوشش کرے جو اس پر واجب ہے، مگر چونکہ وہ بطور انسان موجب خطا ہے، اس لیے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اس کا ضمیر مطمئن ہوگا کیونکہ اس نے صدق نیت کے ساتھ راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اتفاقاً مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں کرسکا، مگر جو آدمی اللہ کو پہچانتا ہی نہیں اور قرآن کے مطابق کافر ہے، اس کا مطمح نظر فقط شخصی و مادی مقاصد و خواہشات نفسانی کا حصول ہے، وہ اپنے انہی مقاصد کے حصول کی خاطر مال خرچ کرتا ہے، پھر جب اپنے مقاصد حاصل ہوتے ہوئے نہیں پاتا تو اس کا دل پریشان ہوجاتا ہے۔ قرآن بھی یہی فرماتا ہے ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْہِمْ حَسْـرَۃً ان کا مال خرچ کرنا ان کے لیے حسرت کی صورت اختیار کرے گا۔ کیا بات یہیں ختم ہوجائے گی،یعنی وہ اپنی دولت خرچ کریں گے، اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور کف افسوس ملیں گے؟ نہیں یہی نہیں ہے ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ نتیجتاً شکست کھا جائیں گےا ورنیست و نابود ہوجائیں گے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ان کے منصوبے خاک میں ملیں گے اور دوسرے مرحلے میں وہ خود شکست سے دوچار ہوں گے۔ یہ آیات نبی اکرم کی ہجرت مدینہ کے اوائل میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ بعد والی آیات غزوہ بدر سے متعلق ہیں۔ غزوہ بدر ہجرت کے دوسرے سال واقع ہوئی۔ مفسرین کے بقول یہ آیات اسی سال نازل ہوئیں۔ اس وقت تک کفار جنگی سازوسامان، افرادی قوت، مال و دولت، اقتصادی و فوجی اعتبار سے مسلمانوں سےبہت زیادہ طاقتور تھے۔

قرآن ایک ایسے مستقبل کی بظاہر جس کی پیش گوئی مشکل ہے، خبرغیبی دے رہا ہے، وہ یہ کہ مستقبل میں یہ لوگ اپنی دولت خرچ کریں گے اور ان کا دولت خرچ کرنا ہی ان کی حسرت کا باعث ہوگا کیونکہ آخر میں یہ خود مغلوب ہوجائیں گے اور شکست کھائیں گے۔ قرآن کی یہ پیش گوئی فتح مکہ کے موقاع پر پوری ہوئی۔کیا بات یہیں ختم ہوجاتی ہے، یعنی دولت خرچ کرنا، پھر کف افسوس ملنا اور اس کے بعد شکست کھانا؟ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ بعد کے مراحل زیادہ کٹھن ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَہَنَّمَ يُحْشَــرُوْنَ ان سب کو دوزخ میں جمع کردیا جائے گا۔

یہ آیہ مبارکہ جس کو میں نے تلاوت کیا، چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ کفار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہیں گے، بلکہ مستقبل میں زیادہ خرچ کریں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود دیکھ لیں گے کہ اس دولت کے

خرچ کرنے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوا ، لہٰذا اپنی دولت کے ضائع ہونے کا انہیں قلق ہوگا ۔ تیسرے یہ کہ وہ خود بھی شکست فاش کھائیں گے جیسا کہ انہوں نے فتح مکہ میں شکست کھائی۔ چوتھے یہ کہ ان کا مستقبل بہت زیادہ بھیانک اور تاریک ہے جو ان کا جہنم میں محشور ہونا ہے۔

لِيَمِيْزَ اللہُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَہٗ عَلٰي بَعْضٍ فَيَرْكُمَہٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَہٗ فِيْ جَہَنَّمَ۝۰ۭ اُولٰۗىِٕكَ ہُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝۳۷ۧ (انفال:۳۷) دنیا میں کوئی مطلق برائی نہیں۔ کوئی بری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی خوبی نہ رکھتی ہو۔ جو چیزیں بظاہر بری معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بھلی ہوتی ہیں ان میں ایک آزمائش الٰہی ہے۔ جب معاشرہ میں امن و امان ہوتا ہے یعنی کوئی بڑی آزمائش نہیں ہوتی تو انسان سب لوگوں کو ایک ہی جیسا سمجھتا ہے یعنی سب ایک دوسرے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ انسان خیال کرتا ہے کہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں، بلکہ بعض افراد دوسروں کی نسبت بہتر نظر آتے ہیں اور انسان ان کو اچھا سمجھتا ہے یہاں تک کہ ان کو کسی تلخ واقعے، اور قرآن کی تعبیر میں، آزمائش کا سامنا ہوجاتا ہے۔ اس وقت انسان دیکھتا ہے کہ لوگ اس طرح چھانٹے جاتے ہیں جس طرح چھلنی باریک اور موٹے دانوں کو الگ الگ کردیتی ہے۔ باریک دانے ایک طرف ہوجاتے ہیں اور موٹے دوسری طرف۔ لوگ چھانٹے جاتے ہیں۔ کچھ ایک طرف چلے جاتے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ اصطلاح جدید میں اسے صفیں جدا ہوجانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بہت افسوسناک بات ہے۔ انسان اچانک دیکھتا ہے کہ جن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ غلط ثابت ہوئے۔ مگر ارباب فراست اور بالغ النظر افراد اس طرح صفوں کے دجا ہونے کو بہتر جانتے ہیں۔ مثلاً اگر پیغمبراکرمؐ مکہ میں مبعوث برسالت نہ ہوتے اور فرض کریں کہ ہمیں مکہ کے اس معاشرے میں لے جایا جاتا تو ہم وہاں سب ک ایک جیسا دیکھتے، سب ایک جیسے ہی نظر آتے، یعنی ہم ابوجہل و ابوسفیان کو دیکھتے، عمارؓ بن یاسر و ابوذرؓ غفاری کو بھی دیکھتے اور ہمیں ان میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ لیکن پھر ظہوراسلام اور نزول قرآن جیسا عظیم واقعہ رونما ہوتا ہے جو ایک انقلاب پیدا کردیتا ہے۔ ہم دیکھتے کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے الگ نظر آنے لگتے ہیں، بالکل ان عناصر کی مانند کہ جو آپس میں مخلوط ہوتے ہیں لیکن کیمیاوی تجزیہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرکے رکھ دیتا ہے، ہر حصہ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: لتبلبلن بلبلۃ ولتفربل غربلۃ ولتساطن سوط القدر حتی یعود اسفلکم اعلاکم واعلاکم اسفلکم یعنی تمہیں تلخیوں کا سامنا کرنا پڑے

گا، تم بری طرح تہ و بالا ہوجاﺋو گے، اس طرح چھانٹے جاﺋو گے جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے، پھر اس طرح ملا دئیے جاﺋو گے جس طرح ایک دیگ جب جوش کھاتی ہے تو جو اجزا تہ میں ہوتے ہیں اوپر آجاتے ہیں اور اوپر کے اجزا تہ میں چلے جاتے ہیں۔

کتنی خوبصورت تشبیہ ہے! مثلاً اگر آپ دیگ میں آلو، پیاز، گوشت، چنے اور لوبیا وغیرہ ڈال دیں تو ان میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ نظر آئے گی۔ مثلاً فقط مرچیں اور ہلدی پانی کے اوپر رہیں گی، لیکن جب آپ اس قدر آگ جلائیں گے کہ دیگ میں اُبال آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ دیگ کے اندر کی چیزیں تہ و بالا ہوگئی ہیں نیچے والی اوپر آگئیں اور اوپر والی نیچے چلی گئی ہیں۔ یہ تشبیہ بہت خوبصورت ہے۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ جب لوگ آزمائشوں، ابتلائوں اور تلخیوں سے دوچار ہوتے ہیں تو اس طرح چھانٹے جاتے ہیں جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور جس طرح دیگ کے اندر کی نیچے والی چیزیں زیادہ حرارت کی وجہ سے اوپر اور اوپر والی چیزیں نیچے چلی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال لوگوں کی ہوجاتی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں رونما ہونے والے جھگڑوں، تضادات اور حق و باطل کی جنگوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اپنے اور بیگانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ان کی صفیں الگ الگ ہوجائیں۔ اس صورت میں اہل حق اور ارباب بصیرت اپنے فرائض کا بہتر طور پر ادراک کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایک فائدہ بتا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لِيَمِيْزَ اللہُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ انہیں یہ کام کرنے دو تاکہ اللہ اس ذریعہ سے پلید کو پاکیزہ سے الگ کردے اور ان کی صفیں الگ الگ ہوجائیں۔ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَہٗ عَلٰي بَعْضٍ فَيَرْكُمَہٗ جَمِيْعًا برے لوگوں کو اوپر تلے چن کر ان کا ڈھیر لگائے، سب ایک طرف ہوجائیں اور سب کو یکجا جمع کردے۔ پاک لوگ ان سے الگ ہوجائیں۔ پاکیزہ لوگ فقط پاکیزہ لوگوں ہی کے ساتھ ہوں۔ جب ایسا ہوجائے کہ صفیں الگ ہوجائیں، پاکیزہ لوگ الگ صف میں چلے جائیں اور پلید دوسری صف میں، تو اس وقت فیصلہ کن کامیابی پاکیزہ لوگوں کو نصیب ہوگی اور پلید افراد سب جہنم میں ڈال دئیے جائیں گے فَيَجْعَلَہٗ فِيْ جَہَنَّمَ۝۰ۭ پس ناپاک لوگوں کو ایک ساتھ جہنم میں ڈال دیا جائے گا اُولٰۗىِٕكَ ہُمُ الْخٰسِـرُوْنَ صرف یہی لوگ بدبخت ہوں گے۔

قرآن کے بقول طیب و خبیث اور پاک و ناپاک کی اس جنگ کی بحث کا سلسلہ یہاں فی الحال اختتام کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ بعد والی آیت میں نبی

اکرمؐ کے ذریعہ ان پر اتمام حجت فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ! ان کافروںکو بتادیجیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ وہ جہاں سے بھی لوٹ آئیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے گا۔

یہ بات خاص طور پر یاد رہے کہ جب تک انسان زندہ ہے، کوئی کام کرسکتا ہے، اور اپنے ارادہ، انتخاب و اختیار کا مالک ہے اس وقت تک قرآن اس کو ناامید و مایوس نہیں کرتا۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ بندہ کے لیے توبہ کا دراز ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ توبہ صرف الفاظ ہی سے عبارت نہیں۔ یعنی صرف زبان سے استغفراللہ ربی واتوب الیہ کہہ دینا ہی توبہ نہیںہے۔ توبہ کا مطلب ہے بازگشت۔ قرآن اتمام حجت کرتےہوئے فرماتا ہے: ’’اے پیغمبرؐ! ان کافروں کو بتادیجیے کہ جس راستہ پر یہ چل رہے ہیں اگر اس سے لوٹ آئیں تو ان کے تمام گزشتہ اعمال پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔‘‘ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ان کافروں سے کہہ دیجیے: اِنْ يَّنْتَہُوْا، يَّنْتَہُوْا ’’نہی‘‘ سے مشتق ہے۔ نہی کرنا کے معنی منع کرنا ہیں۔ (انتہا کے معنی باز رہنے کے ہیں) اگر وہ باز رہیں اور اس راستے سے پلٹ آئیں جس پر چل رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ اللہ اپنے بندہ کے ساتھ کبھی ہٹ دھرمی سے پیش نہیں آتا۔ يُغْفَرْ لَہُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۝۰ۚ اگر لوٹ آئیں گے تو ان کے تمام سابقہ اعمال پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔ يُغْفَرْ غفران سے مشتق ہے۔ عموماً ہم غفران کے معنی آمرزش(۱۹) لیتے ہیں اور یہی درست ہے۔ ہماری زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو اپنے اندر ’’غفران‘‘ کے معنی لیے ہوئے ہو۔ غفران کا لفظ ڈھانکنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مغفرت و بخشش کو اس لیے غفران کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انہیں چھپا دیتا ہے۔ يُغْفَرْ لَہُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۝۰ۚ اگر توبہ کرلیں تو جو کچھ ہوچکا ہے، یعنی جن برے اعمال کے وہ مرتکب ہوچکے ہیں، بخش دئیے جائیں گے یعنی ان کو چھپا دیا جائے گا، وہ کالعدم ہوجائیں گے، ان سے صرف نظر کرلیا جائے گا۔ لہٰذا ’’غفران‘‘ کے معنی پہننے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ حافظ شیرازی کی ایک غزل ہے جو تقریباً اسی طلب مغفرت کے بارے میں ہے، دراصل مناجات ہے جو غزل کی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ کہتا ہے:

ما درین در نہ پے حشمت و جاہ آمدہ ایم

از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم

رہرو منزل عشقیم ز سرحد عدم

تا بہ اقلیم وجود این ہمہ راہ آمدہ ایم

(ہم اس دروازہ پر جاہ و جلال کی طلب میں نہیں آئے بلکہ برائیوں سے بچنے کے لیے یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ ہم منزل عشق کے مسافر ہیں اور ہم نے عدم کی وادی سے اقلیم وجود تک کا اتنا طویل راستہ طے کیا ہے)

دراصل میرا مقصود یہ شعر ہے:

آبرو می رود ای ابر خطا پوش بیار

کہ بہ دیوان عمل نامہ سیاہ اامدہ ایم

(ہماری آبرو خطرہ میں ہے۔ اے خطائو پر پردہ ڈالنے والے بادل، برس کہ ہم دیوان عمل میں سیاہ نامہ اعمال لے کر آئے ہیں)

وَاِنْ يَّعُوْدُوْا لیکن اگر نہ لوٹیں بلکہ اپنی سابقہ خطائوں اور گناہوں کو جاری رکھیں (اس مقام پر قرآن کنایہ کی صورت میں جواب دے رہا ہے) فَقَدْ مَضَتْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِيْنَتو ان سے کہہ دیجیے کہ جو سلوک ہم نے سابقہ امتوں سے روا رکھا تھا وہ گزر چکا ہے۔ یعنی تمہارا انجام بھی وہی ہوگا۔

قرآن کی یہ تعبیر بہت عجیب ہے۔ یہ نہیں فرماتا کہ اگر تم اپنے سابقہ اعمال دوبارہ کرو گے تو ہم ایسا کریں گے، حالانکہ مقصود یہی ہے۔ بلکہ قرآن تنبیہ کررہا ہے کہ ہم (اللہ) جو کام بھی کرتے ہیں اس کے سلسلہ میں ہمارا ارادہ جزوی نہیں ہوتا، یعنی ایسا نہیں کہ ہمارے ارادہ کا تعلق کسی خاص چیز سے ہو، بلکہ ہمارا ارادہ ایک ضابطہ وقانون ہے۔ ماضی میں اللہ کا قانون یہ رہا ہے کہ خاطی، مجرم، گناہ گار اور گمراہ اپنے کیف کردار تک پہنچا ہے۔ پس تم بھی ایسی ہی سزا پائو گے۔

وَقَاتِلُوْہُمْ حَتّٰي لَا تَكُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّہٗ لِلہِ۝۰ۚ فَاِنِ انْتَہَوْا فَاِنَّ اللہَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۳۹ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللہَ مَوْلٰىكُمْ۝۰ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۴۰ (انفال:۳۹۔۴۰) مسلمانو! ان کفار سے لڑے جائو یہاں تک کہ کوئی فساد (باقی) نہ رہے (اور ساری خدائی میں) اللہ کا دین ہی دین ہوجائے۔ پھر اگر یہ لوگ (فساد سے) باز آجائیں تو اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ اور اگر سرتابی کریں تو (مسلمانو) سمجھو کہ اللہ یقیناً تمہارا مالک ہے اور وہ کیا اچھا مالک اور کیا اچھا مددگار ہے۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ قرآن میدان کارزار کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کفار چین سے نہ بیٹھیں گے بلکہ اپنا مال خرچ کریں گے۔ قرآن مومنین اور مسلمین کو خبردار فرما رہا ہے کہ ہر چند کفار کا انجام شکست کھانے، افسوس کرنے اور مغلوب ہوجانے سے عبارت ہے مگر یہ سب کچھ اس صورت میں ہوگا جب اہل ایمان اپنا فرض، جو کہ باطل کا مقابلہ کرنا ہے، ادا کرتے رہیں۔

اس مقام پر قرآن جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے، یہ نہیں کہتا ہے اطمینان رکھو کہ وہ خودبخود شکست کھاجائیں گے اور نیست و نابود ہوجائیں گے، جیسے عموماً ہم کہتے ہیں کہ وہ خود ہی نیست و نابود ہوجائیں گے ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَقَاتِلُوْہُمْ حَتّٰي لَا تَكُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّہٗ لِلہِ۰ۚ ان سے جنگ کرو، یعنی وہ جو واپس نہیں لوٹتے، باطل کے راستہ پر جمے ہوئے ہیں، جب دیکھو کہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں، اپنی دولت باطل راستے میں خرچ کررہے ہیں، تو تم بھی مردانہ وار ان سے جنگ کرو۔ ایسا کیوں! حَتّٰي لَا تَكُوْنَ فِتْنَۃٌ تاکہ فتنے کا قلع قمع ہوجائے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے اسلام میں جہاد کا فلسفہ واضح ہوجاتا ہے یعنی اسلام وہ دین ہے جس کے بنیادی احکام میں ایک جہاد بھی ہے۔ جہاد کے معنی جانبازی یعنی جنگ کرنے کے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی کسی قدر وضاحت کردی جائے، ہر چند کہ بعدا زاں خصوصاً سورہ برات میں، جہاد کے بارے میں بہت سی آیات اور یہ بحث اسی مقام سے تعلق رکھتی ہے۔

غیرمسلم بالخصوص عیسائی، قدیمی مذاہب میں سے کسی مذہب کے پیرو ہوں یا برائے نام کسی مذہب کو ظاہر کرتے ہوں، بلکہ درحقیقت مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرتے ہوں، اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے جبکہ دین میں جہاد نہیں ہونا چاہیے۔ دین کے لیے لازم ہے کہ لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے، وہ قبول کرنا چاہتے ہوں تو قبول کریں، نہ چاہتے ہوں تو نہ کریں۔ اس اعتراض کا بہت ہی واضح جواب ہے۔ اگر دین عیسائیت ایسا دین ہو، یعنی اس دین کی تعلیمات وہی ہوں جو عیسائیت کی ہیں، تو پھر ان کی بات اس فلسفی کے قول کے مانند ہے جو ایک مکتب وجود میں لاتا ہے اور اس مکتب سے لوگوں کو آشنا کرنا چاہتا ہے، یا ایک ناصح کے مانند ہے جو لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ ایک ناصح، مثلاً شیخ سعدی، ایک ناصح ہے اور ناصح چونکہ ناصح ہی ہوتا ہے اس لیے اس کا کام فقط پندونصیحت کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے

ما نصیحت بہ جای خود کردیم و رفتیم

ہر کہ می خواہد بشنود ہر کہ خواد نہ شنود

یعنی ہم نے برمحل نصیحت کردی اور جارہے ہیں، جو شخص اس پر کان دھرنا چاہے دھرے، جو نہ دھرنا چاہے نہ دھرے۔ حافظ شیرازی کہتا ہے:

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم

تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

میں تبلیغ کا تقاضا پورا کرتے ہوئے تمہیں نصیحت کیے دیتا ہوں چاہے، تم میری بات سے نصیحت پکڑو، چاہے ملول ہوجائو۔

میرا فرض فقط یہی ہے کہ تمہیں اپنی بات سنادوں، اب تم چاہو اسے قبول کرو یا نہ کرو۔

ایک ناصح کے باب میں، جس کی ذمہ داری صرف وعظ و نصیحت سے آگے نہیں بڑھتی یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن وہ دین جو پندونصیحت پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو اور معاشرے کی تشکیل و تربیت کرنا چاہتا ہو، وہ دین جس کے احکام میں تشکیل حکومت شامل ہو، کیا ممکن ہے کہ حکم جہاد سے تہی دامن ہو؟ وہ دین جو اعلان کرتا ہو کہ میں دنیا میں حکومت دینی قائم کرنا چاہتا ہوں، میری تعلیمات ایک خاص مکتب فکر پر مبنی ہیں جس کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے تمام امور اسی مکتب کی بنیاد پر استوار ہوں، وہ مسلمانوں کو ایک جداگانہ معاشرتی اکائی میں تبدیل کرنا چاہتا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا دین حکومت تو تشکیل دے مگر اس کی کوئی فوج نہ ہو، اس کے فداکار نہ ہوں، جہاد و دفاع کا حکم نہ دے؟ اگر آپ کو دنیابھر میں کوئی ایسی حکومت ڈھونڈے سے مل جائے جس کی فوج نہ ہو تو کہیے گا کہ اسلام نے فوج بھرتی کرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ اسلام کا موازنہ ان ادیان سے نہیں کرنا چاہیے جن کی تمام پونجی نصیحت کے چار لفظوں تک محدود ہے۔ اسلام اپنے آپ کو معاشرہ کی تمام مشکلات کا جوابدہ جانتا ہے۔ جبکہ کوئی اور ناصح اپنے آپ کو جوابدہ قرار نہیں دیتا۔ البتہ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حکومت اسلامی کے قیام کا کیا مقصد ہے؟ اسلام کے پیش نظر فوج بھرتی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسلام کے نزدیک ہدف جہاد کیا ہے؟

کسی کا مقصد استبداد ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اس کی چوکھٹ پر سرجھکائے رہیں۔ کسی کا مقصد استبداد کے مقابلے سے عبارت ہوتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ طاقت موجود رہتی ہے۔ یا تو اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے یا اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں جہاد نہیں کرتا تو درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ظلم کے سامنے سرتسلیم خم کرتا ہوں۔ البتہ حضرت عیسیٰ کی ذات اس سے برتر ہے کہ آپ نے ایسے احکام دئیے ہوں۔ یقیناً اس بات کا تعلق بھی ان امور سے ہے جو بعد میں عیسائیت میں شامل کیے گئے ہیں یعنی اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ دو اور قیصر کا کام قیصر پر۔ انہوں نے طریقہ ہائے کار تقسیم کردئیے ہیں، ایک حصہ قیصر سے مختص کردیا ہے اور دوسرا اللہ سے۔ جو حصہ قیصر سے متعلق ہے اس سے اللہ کا کوئی سروکار نہیں ہے اور جو اللہ سے متعلق ہے اس کا قیصر سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کام قیصر کے کرنے کے ہیں ان سے خدا کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور جن کاموں سے قیصر کو کوئی سروکار نہیں، وہ کام اللہ کے کرنے کے ہیں۔

واضح سی بات ہے کہ اس طرح تمام بنیادی کام تو قیصر کے اختیار میں آگئے فقط نماز، دعا اور طلب شفا وغیرہ ایسے انگلیوں پر گنے جانے والے امور خدا کے حصے میں آتے ہیں۔ اسلام میں ایسی کوئی صورت نہیں۔ اسلام کا اعلان ہے کہ انسان کے ہر کام کا تعلق اللہ اور دین سے ہے۔ لہٰذا چونکہ دنیا میں طاقت ہمیشہ موجود رہی ہے لہٰذا دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی پڑتا ہے۔ گویا یا تو اس نظریے کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ استبداد کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے یا اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ظلم و استبداد کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑا ہونا لازم ہے۔ ہاں البتہ جہاد کے یہ معنی لیں کہ صرف کمزوروں کو ہی دبایا جائے۔ لیکن طاقت کا جواب طاقت سے دینا فطرت کی ایک سنت ہے۔ یہ اشعار نظامی کے ہیں جو بہت مشہور ہیں۔

تاچند چونچ فسردہ بودن

در آب چو موش مردہ بودن

می باش چو غنچہ کار بردوش

تا خرمن گل کشی در آغوش

کب تک برف کی طرح افسردہ اور پانی میں مرے ہوئے چوہے کی مانند رہو گے۔ تم اس غنچے کی مانند بنو جو اپنے کاندھوں پر کاٹنے لیے ہوئے ہے۔ تاکہ تم پھولوں کا گچھا اپنے دامن میں سمیٹ سکو۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ پھول کا پودا بھی اپنی حفاظت کے لیے کانٹوں سے مسلح ہوتا ہے۔

اس مقام پر بھی قرآن جہاد کا حکم دیتا ہے اور جہاد کے مقصد کو معین فرماتا ہے۔ وَقَاتِلُوْہُمْ ان سے جنگ کرو کس لیے؟ حَتّٰي لَا تَكُوْنَ فِتْنَۃٌ حتیٰ کہ فتنے کا قلع قمع کر دو، فتنہ باقی نہ رہنے پائے۔ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّہٗ لِلہِ ۰ۚ اور فقط اللہ کا دین باقی رہ جائے، یعنی انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کردے ، حقیقت کے سامنے جھک جائے، جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں: وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّہٗ لِلہِ ۰ۚ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب لوگوں کے مسلمان ہونے تک جنگ کرو، کیونکہ یہ بات دین اسلام کے مسلمات میں شامل ہے کہ اسلام اہل کتاب، یعنی کسی بھی آسمانی دین پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کو قبول کرتا ہے، ہر چند کہ عہدحاضر میں ان کا عقیدہ توحید ٹھیک نہ ہو۔ آخر بنیادی طور پر یہ لوگ بھی موحد تھے۔ اسلام فقط شرک کو برداشت نہیں کرتا۔ پس وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّہٗ لِلہِ ۰ۚ کے معنی یہ ہیں کہ ''اور لوگ اللہ کی معرفت حاصل کرلیں یا کم از کم پروردگار کے سامنے سر جھکا دیں۔''

پس اس آیت میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ حکم دے رہا ہے کہ ان لوگوںکے ساتھ جنگ کرو جو مسلح ہیں، مال و دولت خرچ کرتے ہیں اور طاقت استعمال کرتے ہیں۔ فَاِنِ انْتَہَوْا فَاِنَّ اللہَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ وہ جنگ سے باز آجائیں۔ (آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے جو جنگ جو ہیں) اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو بہتر، یعنی پھر تم بھی جنگ سے ہاتھ کھینچ لو۔ اللہ ان کے اعمال سے آگاہ ہے۔ یعنی تم خوفزدہ نہ ہو اور یہ نہ کہو کہ اب جبکہ انہوں نے جنگ بند کردی ہے تو ہم اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔نہیں! بلکہ تم بھی جنگ سے باز آجائو۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا لیکن اگر وہ جنگ بند کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور جنگ کرنے پر مصر رہیں تو تم مت ڈرو۔ فَاعْلَمُوْٓا پس جان لو اَنَّ اللہَ مَوْلٰىكُمْ ۰ۭ اللہ تمہارا ناصر ہے۔ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُاور اللہ بہت ہی اچھا حامی و ناصر ہے۔

یہاں یہ آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ یہ آیات اہل حق اور اہل باطل کی لڑائی کی تجسیم کرتی ہیں۔ بعد والی آیت ایسی ہے جس پر ہمیں تفصیل سے بحث کرنا ہوگی یہ آیت خمس کے بارے میں ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۰ (انفال:۴۱) یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کے بارے میں اہل تشیع اور اہل تسنن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیعہ اس کے وسیع تر معنی بیان کرتے ہیں اور ہم ثابت کریں گے کہ شیعوں کی بیان کردہ تفسیر حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہم خمس، اس کے فلسفہ اور خمس کے سلسلے میں کیے جانے والے سوالات و اعتراضات پر بحث کریں گے۔

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

پانچویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۰ (انفال:۴۱)

اور جان لو کہ جو نفع تم کسی چیز سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ ، رسولؐ، (رسولؐ کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے۔

جس طرح انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کی ہے ہم بھی ویسی ہی تفسیر کریں گے۔ اس کے باوجود یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہم اہل بیتؑ کی تفسیر کے تابع ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کہا ہے اس لیے بس یہی درست ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بیان کردہ تفسیر ان تفاسیر سے بہتر ہے جو دیگر حضرات نے کی ہیں، یعنی اہل بیتؑ کی تفسیر آیت کے مضمون سے قریب تر اور دیگر آیات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ میں پہلے اس آیت کا ترجمہ اختصار کے ساتھ بیان کروں گا اور پھر ان امور کو بیان کروں گا جن کے بارے میں شیعہ و سنی مکاتب اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے: ’’جان لو کہ حکم یہ ہے کہ جو نفع حاصل کرو یا جو کچھ غنیمت میں پائو، اس کا پانچواں حصہ اللہ ، اللہ کےر سولؐ، اقربا یتیموں، مسکینوں اور تہی دست مسافروں کا ہے۔‘‘ ضروری ہے کہ پہلے ہم اس سلسلہ میں اہل تشیع و اہل تسنن کے نظریات کی وضاحت کریں، اس کے بعد آیت کی تفسیر بیان کریں۔

ہم اہل تشیع کے نزدیک ہر زائد نفع پر، یعنی جو محض نفع ہی ہو، خمس ادا کرنا واجب ہے۔ فرض کریں آپ لیکن دین کے عمل میں پچاس ہزار روپے کے وض کوئی مال خریدتے ہیں اور پھر اس مال کو اسی قیمت پر فروخت کردیتے ہیں۔ اس صورت میں آپ نے کوئی نفع حاصل نہیں کیا۔ تاہم اگر آپ اس کاروبار میں نفع حاصل کریں مگر اس کے بدلہ میں آپ نے کام کی مشقت اٹھائی ہو تو اس نفع میں سے جس قدر آپ پر اور آپ کے اہل و عیال پر صرف ہو بشرطیکہ فضول خرچی نہ کریں، اس کو نفع میں

شمار نہیں کیا جائے گا۔ پس جو رقم آپ کے سرمایہ اور ضروریات زندگی سے زائد ہو اس کو نفع کہا جائے گا۔

نفع کی چند امکانی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہی ہے جو ابھی میں نے بیان کی، لیکن ناجائز منافع پر خمس ادا کرنا درست نہیں۔

نفع کی دوسری قسم خزانہ یا دفینہ سے متعلق ہے جس کے مالک کا کچھ اتاپتا نہ ہو اور وہ کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ ماضی میں بینک کی طرح کا کوئی ادارہ نہیں ہوتا تھا جہاں لوگ اپنا مال یا قیمتی اشیا بطور امانت رکھ دیتے اور بے فکر ہوجاتے۔ معبدوں میں اس کام کا کسی قدر معمول تھا، لیکن معابد کے علاوہ اس کا کہیں رواج نہ تھا۔ اس لیے مالدار لوگ اپنا مال زمین کے نیچے چھپا دیتے تھے اور عموماً اپنے قرابتداروں اور محرموں کو بھی اس سے بے خبر رکھتے تھے۔ مثلاً باپ اپنے چھوٹے بیٹے کو نہیں بتاتا تھا مبادا اگر اسے بتا دیا جائے کہ فلاں جگہ اس قدر مال یا جواہرات چھپائے گئے ہیں تو وہ کسی اور کو بتا بیٹھے اور پھر کوئی چور یا ڈاکو اسے نکال لے جائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شخص اپنے وارث کو بتانے سے پہلے ہی دنیا سے چل بستا اور یہ مال زمین کے اندر دبا ہوا رہ جاتا۔ بعض دولت مندوں اور سلاطین کے پاس بڑے بڑے خزانے ہوتے تھے جن کو وہ زمین میں دبا دیتے تھے اور کسی کو ان کی خبر تک نہ ہوتی۔ اس دفینہ کو سو سال یا ہزار سال یا دو ہزار سال گزرجاتے مگر کسی کو علم نہ ہوتا بعد میں اتفاقاً کوئی شخص کسی وجہ سے زمین کے کسی حصے کی کھدائی کرتا تو اچانک اسے وہ خزانہ مل جاتا، یعنی عباسی و اموی خلفا کے عہد کی رقوم، زمانہ جاہلیت کے سکے، بعض اوقات سلجوقی و صفوی عہد کے سکے اسے مل جاتے۔ زمین کے مالک کے ہاتھ اس طرح کا خزانہ لگتا وہ مفت میں اس کا مالک بن جاتا اور یہ ایک مفت کی آمدنی ہوتی جس کے بدلہ میں اس کاکچھ خرچ نہ ہوتا۔ اس قسم کے مال پر خمس واجب ہے۔ کانوں اور ان جواہر کا، جو غوطہ لگا کر حاصل کی جاتی ہیں، شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے اور ان سب کا فلسفہ تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔

ہمارے ائمہ کے نزدیک (شیعہ فقہ ائمہ کی روایت سے بھری پڑی ہے) یہ ہے کہ انسان کو اس طرح جو خالص نفع پہنچا ہو یعنی اس کے حصول پر جو اخراجات آئے ہوں، چاہے اخراجات ایسے ہوں جو اس نفع کو حاصل کرنے پر آئے ہوں یا جس شخص نے اس نفع کو حاصل کیا ہے اس کی اجرت پر اٹھے ہوں، ان سب کو نکال کر جو بچ جائے اور اس پر بلاعوض نفع کا اطلاق ہوسکتا ہو، اس پر خمس ادا کرنا واجب ہے۔ شیعہ فقہ کے مطابق جن

چیزوں کا خمس ادا کرنا واجب ہے ان میں سے ایک جنگ کا مال غنیمت بھی ہے، یعنی مسلمان اپنے ایسے دشمن سے نبرد آزما ہوتے ہیں جو ان کا خون بہانا حلال جانتا ہے اور مسلمان بھی اس کا قتل جائز جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طرفین اپنے اپنے اعتقاد کے مطابق ایک دوسرے کا خون بہانا جائز جانتے ہیں تو ان کا مال بھی بدرجہ اولیٰ جائز و حلال ہے۔ دارالحرب میں جو مال بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئے اس کو خالص آمدنی شمار کیا جاتا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جن کا پانچواں حصہ بطور خمس نکالنا واجب ہے اور باقی چار حصوں کو لشکریوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

خمس کے بارے میں اہل تشیع اور اہل تسنن کے درمیان اختلافی امور

اہل تسنن کے نزدیک صرف جنگی غنائم پر خمس واجب ہے۔ جنگی غنائم کے علاوہ وہ کسی چیز پر خمس ادا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خمس کے حوالہ سے اہل سنت واہل تشیع کے درمیان زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ خمس کو جنگی مال غنیمت سے مختص کرتے ہیں جو ایک استثنائی امر بن جاتا ہے یعنی کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ بہرحال ان کے نزدیک مال غنیمت جنگ کے مواقع سے مختص ہے۔ لیکن اہل تشیع کے اعتقاد کے مطابق خمس ایک لگاتار و دائمی چیز کا نام ہے، جنگ کے زمانہ سے مختص نہیں۔ یہ لوگوں کی پوری اقتصادی زندگی پر محیط ہے۔

خمس کے حوالہ سے یہ ایک مسئلہ ہے جس کے بارے میں اہل سنت و اہل تشیع مختلف آرا رکھتے ہیں ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اس اختلاف کا آغاز کہاں سے ہوا۔

خمس کے حوالے سے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ چاہے ہم خمس کو جنگی مال غنیمت سے مختص کریں یا اس سے مخصوص قرار نہ دیں، اسے کتنے حصوں پر تقسیم کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ شیعہ فقہ کے مطابق خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے، تین حصوں کو ’’مال امام‘‘ کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے تین حصوں کو ’’مال سادات‘‘ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم بعد میں عرض کریں گے کہ انہیں مال امام اور مال سادات کیوں کہا جاتا ہے۔

اہل تسنن کہتے ہیں کہ خمس کے چھ نہیں بلکہ پانچ حصے کرنا لازم ہے۔ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اہل تشیع کس کے لیے کہتے ہیں کہ خمس کے چھ حصے ہوں اور اہل سنت کیوں کہتے ہیں کہ پانچ حصے ہوں۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ خمس خواہ جنگی مال غنیمت سے ہو یا عام محصولات سے حاصل ہو، اس کے پانچ حصے کریں یا چھ، اسے کن امور میں خرچ کرنا چاہیے۔ جب ہم ثابت کردیں گے کہ ان تین مسائل میں اہل تشیع صائب الرائے ہیں تو پھر چوتھا مسئلہ جو ہمیں درپیش ہوگا وہ یہ ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک اس حکم کا فلسفہ کیا ہے۔

خمس کن چیزوں پر واجب ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے کہ کن چیزوں پر خمس واجب ہے تو ہم عرض کرچکے کہ اہل تسنن کے نزدیک فقط جنگی مال غنیمت پر خمس ادا کرنا واجب ہے جبکہ اہل تشیع کہتے ہیں کہ ہر وہ خالص آمدنی جس کے بدلہ میں کسی شخص نے کوئی چیز صرف نہ کی ہو اس پر خمس واجب ہے۔ وجہ اختلاف غَنِمْتُمْ کا لفظ ہے۔ غَنِمْتُمْ کے کیا معنی ہے؟ اگر ہم سنی بھائیوں کے ساتھ بحث و تمحیص نہ کرنا چاہیں تو صرف یہ کہیں گے کہ ہمارے ائمہؑ نے حکم دیا ہے کہ غَنِمْتُمْ سے مراد ہر طرح کی خالص و بلاعوض آمدنی ہے۔ لیکن اہل سنت اگر ہمارے ساتھ بحث کرنا چاہیں کہ آپ کے اماموں کی بات درست ہونے کی دلیل کیا ہے، تو ہمیں غَنِمْتُمْ کے لفظ کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ عربی لغت اس لفظ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ اگر عربی لغت کے مطابق غَنِمْتُمْ کا لفظ غنم۔ یغنم۔ غانم۔ مغنوم سے مشتق ہو تو اس سے مراد دارالحرب سے ہاتھ لگنے والا مال غنیمت ہوگا۔ اس صورت میں یہ اس مال غنیمت سے مختص ہوگا جو دارالحرب سے حاصل ہوا ہو۔ لہٰذا ہم تسلیم کریں گے کہ ان کی دلیل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم لغت سے رجوع کریں اور پتہ چلے کہ غنم۔ یغنم کے الفاظ اور جو د یگر الفاظ ان سے مشتق ہوں وہ وسیع تر مفہوم کے حامل ہیں اور دارالحرب کے مال غنیمت کے لیے مختص نہیں ہیں۔ تو اس صورت میں ہم کہیں گے کہ اہل تشیع کا نظریہ درست ہے۔

سب سے پہلے ہم قرآن کریم کی جانب رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس لفظ کو کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

غنم کا مادہ قرآن کریم میں تین مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ (یہ تین مقامات اس مقام کے علاوہ ہیں جہاں غنم کا لفظ گوسفند کے معنی میں آیا ہے) ایک مقام اس آیت سےپہلے تھا فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ (انفال:۶۹) یعنی اب تم نے جو مال غنیمت حاصل کیا اسے کھاؤ وہ بھی اس آیت کے مانند ہے۔ جو کچھ ہم یہاں کہیں گے وہ اس پر بھی صادق آتا ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں آتا ہے فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۰ۭ (نساء:۹۴) یعنی اللہ کے پاس بہت

زیادہ مغانم ہیں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ بہت سے منافع جو تم دنیا میں حاصل کرنا چاہتے ہو اور جو تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہیں، وہ سب اللہ کے پاس موجود ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف دارالحرب سے حاصل ہونے والا مال غنیمت ہی اللہ کے پاس ہے، بلکہ اس سے زائد فضل خدامراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کو جو کچھ بھی عطا فرماتا ہے اپنے فضل سے دیتا ہے، یعنی انسان اللہ سے کسی چیز کے حصول کا حق نہیں رکھتا بلکہ اللہ جو چیز بھی بندہ کو عطا فرماتا ہے وہ اس کا فضل و عنایت ہوتی ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ''مغانم'' کا لفظ قرآن میں جس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے وہ دارالحرب کے مال غنیمت کے لیے مخصوص نہیں۔ پس معلوم ہوگیا کہ اگر اس لفظ کے معنی صرف دارالحرب سے حاصل شدہ مال غنیمت کے ہی ہوتے تو پھر قرآن کا یہ کہنا فَعِنْدَ اللہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ ۰ درست نہ ہوتا بلکہ اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ استعمال ہونا چاہیے تھا۔

دوم، نبی اکرم سے منقول ایک حدیث ہے جس کو اہل سنت نے بھی نقل کیا ہے، خصوصاً ''نہایہ ابن اثیر'' میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: من لہ الغنم علیہ الغرم فقہ میں اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے اور اہل سنت بھی قبول کرتے ہیں کہ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص نفع اٹھاتا ہے، نقصان بھی اسی کو اٹھانا ہوتا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ اس حدیث میں ''غنم'' دارالحرب کے مال غنیمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ نفع کے معنی میں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ''غنم'' کا لفظ ہر طرح کے نفع کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پیغمبراکرم کی ایک حدیث بھی اس بارے میں بطور دلیل پیش کردی گئی ہے۔

رہا لغت کا معاملہ تو ہم ماہرین لغت میں ایک عرب ماہر کا انتخاب کرتے ہیں جو نہ شیعہ ہے نہ سنی، بلکہ غیرجانبدار ہے۔ وہ ہے ''المنجد'' کا مولف جو عیسائی ہے اور لبنان کا رہنے والا ہے۔ (لبنان کے تقریباً ایک تہائی باشندے عیسائی ہیں) جب ہم ''المنجد'' کی طرف رجوع رکتے ہیں اور ''غنم یغنم'' کا مادہ دیکھتے ہیں تو یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ ''من غنم مالا'' یعنی جس شخص کو کوئی مال معاوضہ کے بغیر ملے اور مفت میں ہاتھ آئے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ دارالحرب کا مال غنیمت ''غنم اور غنیمت'' کا صرف ایک مصداق ہے، اس میں منحصر نہیں۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ اس عیسائی عرب نے بھی اس لفظ کے وہی معنی بیان کیے ہیں جو شیعہ علما نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ البتہ شیعہ علما نے یہ معنی اپنے آپ بیان نہیں کیے بلکہ اپنے ائمہ کی زبان سے سن کر بیان کیے ہیں۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ ائمہ نے فرمایا ہے وہ عربی زبان اور لغت

سے مطابقت رکھتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہو کہ اس نظریہ کو آنکھیں بند کر کے قبول کرلو۔

ایک مثال

عموماً جب کوئی شخص سفر سے واپس آتا ہے تو اسے دعا دیتے وقت خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص سفر پر جانا چاہے تو اس موقع پر اس کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے اور عرب اسے سالما و غانما کہتے ہیں۔ ''سالما'' تو سلامتی کے ہی معنی دیتا ہے جبکہ ''غانما'' کے معنی یہ ہیں کہ فائدہ کے ساتھ واپس لوٹے۔ اس طرح کیا ''غانما'' فقط اس فوجی سے کہا جاتا ہے جو میدان جنگ میں جارہا ہے؟ نہیں، بلکہ سفر پر جانے والے ہر شخص سے یہی کہا جاتا ہے، یعنی تمہارا سفر فائدہ مند ہو۔ ''سالما'' کا مطلب ہے کہ سلامتی کے ساتھ واپس لوٹو اور ''غانما'' کا مطلب ہے کہ فائدہ و منفعت کے ساتھ واپس آئو۔ پس ''غانم'' دارالحرب کے مال غنیمت سے مخصوص نہیں بلکہ ہر فائدہ و منفعت کو غنیمت کہا جاتا ہے۔

چونکہ ہم شیعہ ہیں اور ہمارے ائمہ نے فرما دیا ہے لہٰذا ہمارے درمیان اس مسئلےپر کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر اہل سنت حضرات ہم سے پوچھیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ خمس ہر طرح کی آمدنی کو شامل ہے، (عہدحاضر میں خود کو سنی ظاہر کرنے والے بعض افراد ملتے ہیں جو یہ سوال اٹھاتے ہیں) تو ہم جواب دیں گے کہ ہمارے ائمہ کا فرمان قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن نے یہ نہیں فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ قرآن فرماتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ

اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلی آیات جنگ سے متعلق ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مال غنیمت اس آیت کے مفہوم میں شامل نہیں ہے تاکہ آپ کہیں کہ یہ آیت اپنے سے پہلی آیات سے مربوط نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دارالحرب کا مال غنیمت کی ایک قسم ہے۔ قرآن یہاں ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمانا چاہتا ہے دارالحرب کا مال غنیمت بھی جس کے ضمن میں آجاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن نے یہاں فقط دارالحرب سے حاصل شدہ مال غنیمت کا حکم ہی بیان کرنا چاہا ہو۔ دوسری بات یہ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام نے عام مالیات کے بارے میں بالکل کوئی بات ہی نہ کی ہو؟ زکوٰۃ عام کٹوتی میں شمار نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک خصوصی کیفیت رکھتی ہے اور خاص اموال سے ادا کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ اسلام نے جس کا دعویٰ ہے کہ اس کے احکام لوگوں کے تمام امور زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، عام مالیات کے

بارے میں کوئی حکم نہ دیا ہو؟ لغت کی رو سے یہاں حقیقت شیعوں کا ساتھ دے رہی ہے۔

خمس کتنے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؟

اب ہم دوسرے مسئلہ کی جانب آتے ہیں۔ ہم نے پانچواں حصہ مراد لیا ہے (جن چیزوں کا بھی پانچواں حصہ مراد ہو بہرحال ہم نے قبول کیا ہے) اس پہلو سے اہل سنت اور اہل تشیع میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پانچویں حصہ کو مزید حصص میں تقسیم ہونا چاہیے۔ لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ اس کے چھے حصے ہوں گے جبکہ اہل سنت کے نزدیک اس کے پانچ حصے ہوں گے۔ آئیے قرآن کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ قرآن نے چھ حصے کہے ہیں یا پانچ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن فرماتا ہے: فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۰ۙ (انفال:۴۱) قرآن صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ خمس کے آگے چھ حصے ہیں پھر اہل سنت کیوں کہتے ہیں کہ اس کے پانچ حصے ہونے چاہئیں؟ ان کا کہنا ہے کہ خمس جو کہ اصلی آمدنی کا پانچواں حصہ ہے، اس کے پانچ حصے ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر حصہ ۱۔۲۵ میں منقسم ہوگا، لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ خمس کے چھ حصے ہوں گے جس کے نتیجے میں ہر حصہ لازمی طور پر ۱۔۳۰ ہوجائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اہل سنت نے ایک واضح دلیل کے باوجود قرآن کی تصریح کے خلاف کیوں کہا ہے کہ خمس کے پانچ حصے ہونے چاہئیں؟ وہ اس کے لیے ایک دلیل بیان فرماتے ہیں جس کا ہم جائزہ لیتے ہیں کہ درست ہے یا نہیں۔ ان چھ حصوں میں ایک حصہ اللہ کا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بے معنی بات ہے کہ خدا ایک حصہ لے اور ہم ایک حصہ خدا کو دے دیں۔ کیا خدا مال خرچ کرنا چاہتا ہے؟ اگر ہم نبی اکرمؐ کو یہ حصہ دے دیں تو یہ درست ہوگا کیونکہ آنحضرتؐ انسان ہیں اور صاحب احتیاج ہیں۔ دیگر لوگ بھی ایسے ہوسکتے ہیں ہم پوچھتے ہیں کہ پھر قرآن نے اللہ کا ذکر ہی کیوں کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا ذکر اعزازی طور پر کیا گیا ہے۔ اللہ نے اس مقام پر اپنا نام احتراماً دوسروں کے ناموں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ وگرنہ اللہ کوئی حصہ نہیں لیتا۔ پس اللہ کا ذکر احتراماً ہوا ہے اور دوسرے پانچوں نام اس لیے بیان لہوئے ہیں کہ انہیں واقعاً خمس دیا جائے۔ شیعہ جواب دیتے ہیں کہ بعض اوقات دارالحرب کا مال غنیمت اس قدر زیادہ ہوتا ہے (جس طرح ایرانیوں سے جنگ کے وقت جو مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا تھا) اور مال غنیمت میں ایسی قیمتی اشیا اور سونا چاندی ملتی ہیں کہ کسی فرد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کہاں خرچ کرے۔ انسان لاکھوں کروڑوں کا مالک بن جاتا ہے جیسا کہ

صدراسلام کی جنگوں میں بھاری مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آتا تھا۔ کیا اس صورت میں یہ عقل کے مطابق ہوگا کہ کل مال غنیمت کا ۱۔۲۵ نبی اکرم کا ذاتی مال قرار پائے اور قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور تہی دست مسافروں میں سے ہر ایک کے حصے میں بھی ۱۔۲۵ ہی آئے؟ پس جس طرح یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک حصہ اللہ کے اپنے استعمال میں آئے ویسے ہی یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک حصہ پیغمبراکرم کے استعمال میں آتا ہو، یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام کا تمام مال پیغمبر اکرم کی ذاتی جاگیر قرار پائے اور آپ پر خرچ کیا جائے۔ پیغمبر اکرم تو سب لوگوں سے زیادہ مفلسی میں زندگی بسر کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ کے قرابتداروں کے بارے میں بھی ایسا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اعتبار سے اللہ کا حصہ، پیغمبر کا حصہ اور آپ کے قرابتداروں کا حصہ، یہ سب کے سب اعزازی ہی ہیں۔ پیغمبراکرم کے عہد میں یہ تمام حصے پیغمبراکرم کو امام کے زمانہ میں امام کو اور امام نہ ہونے کی صورت میں نائب امام کو ملتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ پیغمبر، امام، ان کا جانشین اور مسلمانوں کا والی ہونے کے ناطے اس مال کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے، بلکہ وہ اس لیے لیتا ہے کہ اسے مسلمانوں کے عظیم مفادات کے سلسلے میں خرچ کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر پیغمبراکرم اس مال کو اپنے ذاتی استعمال میں لائیں تو اس میں اشکال کا پہلو نکلے گا۔ ان کی ضروریات اتنی زیادہ نہیں ہیں۔ ایک حصہ خدا کا، دوسرا پیغمبر کا، تیسرا قرابتداروں کا، اب انہیں کن امور میں خرچ کیا جائے؟ مسلمانوں کے عظیم اور عمومی مفادات کے لیے انہیں خرچ کیا جاتا ہے اور یہ مسلمانوں کے والی کے اختیار میں بھی ہوتا ہے۔ پس چھ حصے ہی صحیح ہیں، پانچ حصے نہیں۔ تو جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں اس دوسرے مسئلہ میں بھی کہ خمس کے پانچ حصے کران لازم ہیں یا چھ، تو حق اہل تشیع کے ساتھ ہی ہے۔

باقی رہ گیا تیسرا مسئلہ جہاں یتیم، مسکین اور تہی دست مسافرین کا ذکر ہے، یعنی غریب افراد۔ کیا ان سے تمام مسلمان فقرا مراد ہیں یا صرف فقرائے سادات یعنی یتیم سادات کے مسکین اور تہی دست مسافر مراد ہیں؟ شیعہ کہتے ہیں کہ سب غریب سادات مراد ہیں۔ آئندہ تقریر میں ہم اس بارے میں بحث کریں گے۔

چھٹی تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۝۰ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللہِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ۝۰ۭ وَاللہُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۴۱ (انفال:۴۱)

اور جان لو کہ جو نفع تم کسی چیز سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور (رسول کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے، اور اگر تم اللہ پر اور اس غیبی امداد پر ایمان لاچکے ہو جو ہم نے اپنے (خاص) بندہ (محمد) پر فیصلہ کے دن (جنگ بدر میں) نازل کی تھی جس دن (مسلمانوں اور کفار کی) دو جماعتیں باہم گتھ گئی تھیں، اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم عرض کرچکے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ تفسیر کے اعتبار سے اور اس میں پائے جانے والے بہت اہم حکم کی رو سے، جس میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان شدید اختلاف ہے، قرآن کی اہم آیات میں سے ہے۔ آیت خمس یہی ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خمس نہایت معمولی، فروعی اور چھوٹی اہمیت کا مسئلہ ہے، یعنی یہ جہاد کی ایک شاخ ہے۔ ہم بھی اسلام میں جہاد کے قائل ہیں۔ بعض جنگوں میں، یعنی مسلمانوں کے کسی باغی گروہ کے ساتھ جنگ میں نہیں، بلکہ کفار سے جنگ کے موقع پر، جس طرح دنیا کا قانون ہے کہ اگر کوئی جنگ کرے اور دشمن پر فتح پائے تو دشمن کا مال اس کا ہوجاتا ہے، اہل سنت کے نزدیک خمس اسی مال غنیمت تک محدود ہے۔ جنگ میں جس مجاہد یا لشکر کے ہاتھ جو مال غنیمت لگا ہو، وہ اس کے چار حصے اپنے لیے رکھ لیتا ہے اور ایک حصہ خمس کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ وہ معتقد ہیں کہ یہ حصہ پیغمبر اکرم کے عہد میں آنحضرت کو، خلفا کے عہد میں خلفا کو اور ان کے بعد مسلمانوں کے والی، یعنی برسراقتدار مسلمان حکمران کو ملنا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ مال حکمران کے ہاتھ لگے تو وہ اسے کن کاموں میں خرچ کرے اور کس طور پر تقسیم کرے؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو چھ موارد یعنی لِلہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰي وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۝۰ۙ ذکر ہوئے ان میں سے اللہ کا نام صرف احتراماً ذکر ہوا ہے، یعنی خمس کے

حقدار کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے، فقط احترام کے پیش نظر ذکر ہوا ہے، ایسا نہیں کہ واقعی ایک حصہ اللہ ہی کا ہو۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس پانچویں حصہ کے مزید پانچ حصے کرنا ہوں گے جن میں ایک حصہ پیغمبراکرم کا، ایک قرابتداروں کا، ایک یتیموں کا، ایک مسکینوں کا اور ایک حصہ تہی دامان مسافروں کا۔ سوال یہ ہے کہ پیغمبراکرم کی وفات کے بعد حکم کیا ہوگا؟ یعنی آنحضرت کا حصہ کسے دینا ہوگا؟ بعض کہتے تھے کہ آنحضرت کا حصہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ باقی چار جماعتوں کو دے دینا چاہیے۔ بعض کا کہنا تھا کہ پیغمبراکرم کا حصہ سنبھال کر رکھنا چاہیے یہاں تک کہ وہ خلیفہ وقت کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ ایسے نظریات میں سے ہی کسی ایک کے حضرات اہل سنت قائل ہیں اور ہر حال میں اہل سنت کے نظریہ کے مطابق خمس جہاد کی فروعات میں سے ایک ہے اور زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

لیکن شیعہ مذہب میں خمس جہاد سے الگ ایک مستقل حکم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب شیعہ میں دس فروع دین ہیں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، امربالمعروف، نہی عن المنکر، تولیٰ اور تبریٰ۔ اس کے برعکس اہل سنت خمس کو الگ سے ذکر نہیں کرتے، بلکہ اس کو جہاد کی فروعات میں ہی شمار کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں اس قدر اختلاف آخر کیونکر پیدا ہوا؟ اس بات کا تعلق اسی آیت کی تفسیر سے ہے۔ ہمارے ائمہ کا حکم ہے کہ اس آیت میں سے مَا غَنِمْتُمْ مراد وہ تمام منافع و تمام مال مراد ہیں جو مفت میں تمہارے ہاتھ لگے ہوں، جن میں ایک مال غنیمت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ منافع اور بلاعوض ہاتھ آنے والی چیزیں ہی مال غنیمت تک محدود ہوں۔ ہم لفظ غَنِمْتُمْ کے بارے میں پہلے بحث کرچکے ہیں۔ ہم نے قرآن سے بھی دلیل پیش کی ہے کہ یہ مال جنگی مال غنیمت سے بالعموم متعلق ہے ہم نے نبی اکرم کی حدیث کو بھی بطور دلیل بیان کیا ہے اور عربوں کے درمیان رائج محاورات بھی اس کی تائید میں بیان کیے ہیں۔ اگر لفظ غَنِمْتُمْ کے معنی استفتم یعنی جو نفع بھی تمہیں پہنچے تو اس کا پانچواں حصہ دو...کیے ہیں تو دائرہ خمس میں بہت وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرے مسئلے کا تعلق لِلہِ کے لفظ سے ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اس کے چھ حصے ہیں جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کو بھی حصہ لینے اور اسے خرچ کرنے کی ضرورت ہے؟ شیعوں کا جواب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ایک حصہ اللہ کا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں، بالکل اسی طرح جیسے پیغمبراکرم کا ایک حصہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرت اس کو اپنی ذات پر خرچ کریں۔ یہ تین حصے جو کہ اللہ، پیغمبر اور امام کے ہیں، درحقیقت یہ ایسے حصے ہیں جن کو رفاہ عامہ میں خرچ ہونا

چاہیے۔ قرآن کریم کی یہ ایک بنیادی اصطلاح ہے کہ جس چیز کا کوئی مخصوص یا انفرادی مصرف نہ ہو اس کے مصرف کو سبیل اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم زکوٰۃ کے باب میں پڑھتے ہیں وفی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں۔ گویا زکوٰۃ کا ایک مصرف راہ خدا میں صرف کرنا ہے۔ یہاں راہ خدا سے کیا مراد ہے؟ راہ خدا سے مراد ہر وہ راستہ ہے جس سے ہمیں ذاتی منافع حاصل نہ ہوں بلکہ اس میں رفاہ عامہ کا مفاد مضمر ہو۔ مثلاً جب آپ کسی فقیر کو اپنی جیب سے کچھ دیتے ہیں یا مسجد، ہسپتال، مدرسہ کے لیے خرچ کرتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے راہ خدا میں یااللہ کے نام پر خرچ کیا ہے۔ اس طرح کیا خدا کے فائدہ کے لیے بھی کوئی شخص کچھ دیتا ہے؟ واضح سی بات ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ اس مال کو اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، بلکہ جس چیز سے بھی عام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مال یا شے راہ خدا میں دی گئی ہے۔

پس چھ حصوں میں سے تین حصے اللہ، پیغمبرؐ اور امامؑ کے ہیں اور ان حصوں کا رفاعہ عامہ میں ہی صرف ہونا لازم ہے۔ یہاں ایک اہم نکتہ ہے جس کی جانب میں اشارہ کرتا ہوں۔ اسی سورہ انفال کی ایک اور آیت میں بھی ہم اہل سنت سے شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت بھی ایسی ہی ہے۔ سورہ مبارکہ کی سب سے پہلی آیت ہے يَسْـــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ۰ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۰ۚ اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انفال اللہ اور رسولؐ کے لیے مختص ہے۔ یہاں انفال سے کیا مراد ہے؟ اہل سنت کہتے ہیں کہ انفال سے مراد جنگ کا مال غنیمت ہے اور آیہ انفال بھی مال غنیمت ہی سے متعلق ہے۔ عجیب کیفیت یہ ہے کہ قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے والے بعض حضرات نے سورہ انفال کو سورہ غنائم (یا غنائم جنگی) کا نام دیا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ہمارے ائمہؑ نے فرمایا ہے کہ لفظ انفال، جنگی مال غنیمت کے لیے مختص نہیں۔ ''انفال'' سے مراد ہر وہ دولت ہے جس کو انسان نے محنت سے حاصل نہ کیا ہو بلکہ مفت میں ہاتھ آئی ہو، جیسے وہ ثروت جو کائنات میں خودبخود وجود میں آتی ہے، مثلاً جنگل، کوہستانوں میں منفعت بخش چیزیں، وغیرہ جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو۔ یہ سب اللہ اور پیغمبرؐ کا مال ہیں، یعنی پیغمبرؐ اور امامؑ اپنے عہد میں مسلمانوں کے حاکم ہونے کی حیثیت سے ان کو رفاہ عامہ کے کاموں اور راہ خدا میں صرف کرتے ہیں۔ جنگ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا مال انفال کی صرف ایک قسم ہے۔

پس اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ مال غنیمت بھی انفال میں ہی شمار ہوتا ہے۔ آیہ خمس میں اللہ تعالیٰ نے اس عمومی مال کے پانچ حصوں میں سے چار حصے لشکریوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی ہے۔ حقیقت میں یہ مال لشکریوں کا نہیں نہ ہی کسی لشکری کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ چونکہ اس نے جنگ میں حصہ لیا ہے لہٰذایہ اس کا مال ہے۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر تم نے مال غنیمت کی خاطر جنگ کی ہے تو تمہارا جہاد ہی باطل ہے۔ چونکہ تم نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہے لہٰذا اللہ نے وہ کچھ تمہیں دے دیا ہے جو وہ دینا چاہتا ہے۔

شیعہ نقطہ نظر سے جنگی مال غنیمت بھی انفال کا ایک حصہ ہے۔ اسی سے ہمیں ایک اور قانون، قاعدہ کلیہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیزیں پہاڑوں کی چوٹیوں، وادیوں اور جنگلوں میں پائی جائیں، نیز مال غنیمت وغیرہ یہ سب کے سب انفال میں شامل ہیں اور اللہ اور پیغمبر کے اختیار میں ہیں، یعنی یہ چیزیں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ اسی طرح ہمارے ائمہ فرماتے ہیں کہ فقط ان ہی اشیا پر منحصر نہیں بلکہ اگر آپ خزانہ نکالیں تو درحقیقت وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوگا۔ کانیں بھی حقیقت میں کسی کی شخصی جاگیر نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ جو شخص محنت کررہا ہے وہ اگر اپنی محنت کے مطابق خرچ کرے تو اسی قدر وہ اس کا مالک ہوگا۔ اس سے زائد جو نفع اس کو ملا ہے وہ ایسے ہی ہے گویا اس کی ذاتی ملکیت نہ ہو۔ تاہم اللہ اور پیغمبراکرم نے اجازت دے ہے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں، باوجودیکہ دراصل وہ اس کی ذاتی ملکیت میں نہیں، اس کے ۴۔۵ حصہ کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ باقی ۱۔۵ حصہ اصلی مالک یعنی اللہ و پیغمبر کو دینا ہوگا کہ رفاہ خلائق میں خرچ ہو۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ آیہ انفال اور آیہ خمس جو تفسیر اہل تشیع نے کی ہے اور جو اہل سنت نے کی ہے ان میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ شیعوں کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق ان آیات کے معنی و مفہوم میںبہت زیادہ وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک طرف اس کا ربط اسلام کے اقتصادی نظام کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور دوسری جانب اسلام کے سیاسی و حکومتی نظام کے ساتھ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب ہمارے ائمہ سے منقول روایات سے مل جاتا ہے۔ ہم شیعوںکی فقہ کی رو سے خمس کے درحقیقت چھ حصے کیے جاتے ہیں، اللہ کا حصہ، پیغمبر اکرم کا حصہ اور ذی القربی یعنی امام کا حصہ۔ باقی تین حصوں کو مال سادات کہا جاتا ہے جو یتیم، غریب اور تہی دست سادات کے حصے ہیں۔ اس سوال کو دورحاضر کے بہت سے حضرات دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اس طرح کہ وہ

کہتے ہیں کہ اسلام نے اس قسم کا حکم کیوں دیا ہے؟ کیا یہ ایک امتیازی سلوک نہیں جو اسلام نے پیغمبراکرم کی اولاد اور قرابتداروں کے ساتھ روا رکھا ہے، حالانکہ اسلام کے قوانین کسی قسم کے امتیازی سلوک کو تسلیم نہیں کرتے؟ یہ ایک طرح کی اقتصادی برتری ہے اور برتری بھی بہت بڑی۔ دوسرے یہ کہ اصولاً شیعہ فقہ میں سادات و غیرسادات میں فرق کیوں روا رکھا گیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ فرض کریں دنیا کے تمام لوگ مسلمان ہوجاتے ہیں اور وہ خمس ادا کرنا چاہتے ہیں۔ (حضرت امام مہدی کے ظہور کے زمانہ میں یقیناً ایسا ہی ہوگا)، یعنی وہ اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ دینا چاہتے ہیں۔ اتنی زیادہ دولت ہوگی کہ دنیا کے کسی بھی ملک، حتیٰ کہ امریکہ جو دنیا کا امیرترین ملک ہے، کا میزانیہ بھی اتنا نہ ہوگا۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کا نصف مال امام ہے اور اسے مسلمانوں کے رفاہی امور میں خرچ ہونا ہے جبکہ دوسرا نصف حصہ سادات کا ہے۔ اگر دنیابھر کے تمام سادات کو جمع کرکے یہ رقم دے دی جائے تو ایک سال کے اندر اندر ہر سید کروڑ پتی ہوجائے گا، چہ جائیکہ ہر سال یہ تقسیم انجام پاتی رہے۔ اب بھی دنیا میں جو شیعہ موجود ہیں اگر وہ سب خمس ادا کریں اور اس کا آدھا حصہ سادات کو دیں تو سادات کو ملنے والی رقم ایک بہت بڑے میزانیہ کو تشکیل دے گی۔ پس اب اتنے بڑے میزانیہ کا کیا انتظام کیا جائے گا! پھر سب سادات غریب نہیں ہیں۔ ان میں بعض اتنے دولت مند بھی ہیں کہ انہیں خود خمس دینا لازم آتا ہے۔ اس صورت میں اس میزانیہ کا مکلف کون ہوگا؟ پھر کیا یہ سادات کے لیے امتیازی سلوک نہ ہوگا ، اور مسئلہ کو بھی سامنے رکھیں تو اعتراض ایک اور صورت اختیار کرے گا، وہ اس طرح کہ جب ہم فقہا کے فتاویٰ احادیث کی کتب اور شیعہ فقہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خمس ہر سید کو نہیں دیا جاسکتا، صرف اسی سید کو دیا جاسکتا ہے جس میں شرائط پائی جاتی ہوں۔ مثلاً وہ کھلے بندوں فاسق نہ ہو، مال گناہ میں خرچ نہ کرے اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ تہی دست بھی ہو، یعنی نہ تو اس کی اتنی مالی حیثیت ہو جس کے ذریعے وہ اپنی گزراوقات کرسکتا ہو اور نہ ہی یہ کہ وہ کام کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی سید درمیانی حیثیت کی زندگی (جس میں قناعت کرے، اسراف نہ کرے) بسر کرنے کے لیے محنت و مزدوری کرکے اجرت لے سکتا ہو تو اسے خمس نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے عبد جو سادات بچ جائیں گے ان کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ کہتے ہیں کہ سادات کے سوا آپ جس غریب آدمی کو زکوٰۃ دینا چاہتے ہوں اس کو ایک بار ہی اتنی رقم دے سکتے ہیں کہ وہ غنی ہوجائے۔ بالفاظ دیگر ایک آدمی سید نہیں مگرنادار ہے۔ خمس کے علاوہ یعنی زکوٰۃ کی رقم بھی موجود ہے تو

کیا ہم اس آدمی کو ایک مشت ایک لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں جبکہ اس کا سال بھر کا خرچ صرف دس ہزار روپیہ ہو اور باقی ۹۰ ہزار روپیہ کو اپنے سرمایہ کے طور پر باقی رکھ لے؟ اس کا جواب مثبت میں ہے۔ لیکن کی اسید کو بھی اسی طرح مال دیا جاسکتا ہے؟ کیا سید کو بھی یک مشت خمس کی اتنی رقم دی جاسکتی ہے کہ اس سے اس کے سال بھر کے اخراجات پورے ہوجائیں اور باقی کو وہ اپنا سرمایہ قرار دے لے؟ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔

سادات کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ خمس لینے والا زکوٰۃ لینے والوں کی مانند نادار ہو۔ سادات کے لیے ایک اور پابندی بھی ہے، وہ یہ ہے کہ سید کو فقط سال بھر کا خرچ دیا جاسکتا ہے اسے خمس کےذریعہ غنی نہیں کیا جاسکتا۔ پس ہم ایک اور مشکل میں پھنس گئے۔ اب تک ہم یہ کہہ رہے تھے کہ دنیابھر کے لوگ خمس ادا کریں اور سادات ہی کو خمس دیا جائے تو وہ کروڑ پتی ہوجائیں گے۔ پھر دفعتاً ہمیں اس حکم کا علم ہوتا ہے کہ دولت مند اور کام کرنے پر قادر سادات خمس کے مستحق نہیں بلکہ نادار سادات ہی کو خمس دیا جائے، وہ بھی صرف اس قدر جس سے ان کے سال بھر کا خرچ چل سکے۔ پس خمس کی اتنی بڑی رقم کا کوئی استعمال نہیں بنتا۔ آخر اسے کیونکر استعمال میں لایا جائے؟

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ سادات کو خمس دینا ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتنے کے مترادف ہے، یہ سادات کے لیے کوئی برتری نہیں ہے۔ کیونکہ (اسلام) کہتا ہے کہ خمس نادار سادات ہی کو دیا جائے اور اس کے ساتھ یہ پابندی بھی عائد کی گئی ہے کہ اس کے سال کے خرچ سے زیادہ نہ دیا جائے۔ لیکن سوال اس صورت میں باقی رہ جاتا ہے کہ اتنا بڑا میزانیہ اسلام نے کس استعمال میں لانے کے لیے معین کیا ہے؟ ہمارے ائمہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیت میں یہ جو خدا، رسولؐ، ذی القربی، یتیموں، مسکینوں اور تہی دامن مسافروں کے چھ حصے بیان ہوئے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خمس ان کے درمیان تقسیم کردو۔ یہ حصے گویا ان کے لیے مخصوص ہوئے ہیں خمس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ وہ پیغمبرؐاکرم کے ہاتھ میں پہنچے اور پیغمبراکرمؐ کے بعد امامؑ وقت کو ملے۔ پیغمبراکرمؐ یا امام اس رقم سے سادات کی کفالت کرتے ہیں۔ اگر کسی زمانہ میں خمس نہ ملے تو کسی دوسرے میزانیہ سے ان کی کفالت کرنا ہوگی۔ اگر خمس کا مال آجائے تو عام لوگوں کی مالی حالت کے مطابق ان کی کفالت کرنا ہوگی۔ اور باقی رقم رفاعہ عامہ کے امور میں خرچ ہوگی۔ پس تہی دامن سادات کے خرچ سے زائد رقم بھی مسلمانوں کے رفاہی امور میں ہی خرچ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمارے زمانہ میں غریب

سادات زیادہ ہیں اور خمس دینے والے ان سے زیادہ ہیں مگر بعض فقہا احتیاط کے طور پر کہتے ہیں کہ مجتہد اور حاکم شرع کی اجازت کے بغیر سادات کو ان کا حصہ نہ دو۔ انہوں نے یہ اس بنا پر کیا ہے کہ ائمہؑ نے فرمایا ہے: لہ مافضل وعلیہ مانقص یعنی سادات کو امام یا نائب امام کے زیرکفالت ہونا چاہیے۔ اگر خمس ان کے اخراجات سے تھوڑا ہو تو امامؑ یا نائب امام کسی دوسرے میزانیہ سے ان کو دے اور اگر خمس زیادہ ہو تو وہ مسلمان کے رفاہی کاموں میں خرچ ہوتا ہے۔

پس یہ خیال غلط ہے کہ مذہب شیعہ میں بہت بھاری رقم سادات کے لیے مختص کی گئی ہے اور اس طرح سادات کو مالدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خمس کے علاوہ جو میزانیہ ہو اس کے ذریعہ غیرسید کو بھی مالدار بنایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے کہ خمس کی رقم سے سید کو اتنا دیا جائے جو اس کی معمولی زندگی اور سال بھر کے اخراجات سے زیادہ ہو۔ لہٰذ ایہ ضرب المثل کہ ’’خمس سید کا حق ہے چاہے اس کا پرنالہ سونے کا ہی کیوں نہ ہو‘‘ بالکل غلط ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خمس سید کا حق نہیں ہے چاہے اس کے گھر میں پرنالہ بھی نہ ہو، بشرطیکہ وہ کام کرنے پر قادر ہو اور محنت مزدوری کرکے زندگی بسر کرسکتا ہو۔ جو کچھ اسلام اور ہماری فقہ کہتے ہیں اور فقہا کے فتاویٰ کی کتابوں میں تحریر ہے، وہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

پس مذہب تشیع کی بنا پر جس میں خمس کا دائرہ بہت وسیع ہے، سادات کی اقتصادی برتری کا سوال سامنے آتا ہے اور ہم عرض کرچکے ہیں کہ ہمارے ائمہؑ نے اس کا ایسا ٹھوس جواب دیا ہے جس کا کوئی توڑ نہیں اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ سادات کو اقتصادی برتری حاصل نہیں، مگر اسلام نے سادات کے لیے علیحدہ حساب کیوں کھولا ہے؟ مثلاً ایک کمپنی مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی ہے۔ دوسری جانب اس کے اخراجات بھی مختلف ہیں۔ اب جب یہ کمپنی آمدوخرچ کا حساب تیار کرتی ہے تو لامحالہ ہرقسم کا خرچ ایک خاص مد سے پورا کرتی ہے۔ اگر اسے کسی دوسرے حساب سے پورا کرنا چاہے و اس کی کوئی وجہ اور کوئی معیار ہونا چاہیے۔ یہاں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سادات کو کوئی اقتصادی برتری دلانا مقصود نہیں لیکن ایک روحانی و نفسیاتی برتری بہرحال انہیں حاصل ہے اور وہ یہ کہ غریب سادات کو پیغمبراکرمؐ، امامؑ یا نائب امام کی خصوصی سرپرستی حاصل ہے۔ غریسید کی زکوٰۃ سید کو نہیں دی جاسکتی اور یہ صرف خمس ہی لے سکتے ہیں۔ یہ امتیازی سلوک کیوں ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں بعض احکام ایسے پائے جاتے ہیں جو سادات کے لیے مخصوص ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ سادات کا سلسلہ نسب اور اس قوم کی نسلی حیثیت محفوظ رہے۔ ہمارے خیال میں اسلام اس سے زیادہ کا خواہاں نہیں ہے کہ پیغمبراکرم کی اولاد دوسروں کے ساتھ اس طرح مخلوط نہ ہوجائے کہ ان کا نسب مٹ جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ازدواجی تعلقات قائم کریں یعنی سید مرد اور غیرسیدعورت کے ساتھ شادی کرے لیکن اسلام یہ ضرورت چاہتا ہے کہ سادات آبا کی طرف سے اپنا نسب محفوظ رکھیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں میں ایک روحانی احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایک سید کہتا ہے کہ میں پیغمبراکرم کی اولاد ہوں، میں علی ابن ابی طالب کی اولاد ہوں، میں حسین ابن علی کی اولاد ہوں، ماضی میں میرے آباواجداد ایسے تھے، فلاں فلاں فضائل ان میں پائے جاتے تھے۔ یہی چیز موجب بنتی ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ اقتصادی برتری کے حصول کے لیے نہیں بلکہ اسلام کی خدمت کرنے کے لیے اسلام کی جانب بڑھے۔ شاید وراثت میں ملنے والے جرثومے کم و بیش بہت سی نسلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ صدراسلام سے لے کر عہدحاضر تک سادات کرام، خصوصاً علوی سادات میں ایک خصوصیت پائی جاتی رہی ہے جس نے ان کو دوسرے لوگوں کی نسبت اسلام کے تحفظ کی زیادہ رغبت دلائی ہے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانوں میں اکثر تحریکیں علوی سادات نے ہی چلائی ہیں۔ بعد کے زمانوں میں بھی علما، حکما اور ادبا ایسے مختلف طبقوں میں انہی افراد نے اسلام کی زیادہ تر خدمت کی ہے جن کا سلسلہ نسب پیغمبراکرم تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ اسلام اس طبعی خاصیت کے علاوہ فطرتاً انہیں اس امر کی ترغیب دے، انہیں یہ نفسیاتی احساس بھی اسلام کا زیادہ سے زیادہ دفاع کرنے پر مائل کرتا رہا ہے کہ ہم پیغمبراکرم کی اولاد ہیں اور دوسروں سے زیادہ ہمارے لیے اس دین کا تحفظ کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ سادات دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود دینی درس گاہوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ ان مدارس میں دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں شاید ان میں سے ایک تہائی صرف سید ہی ہوتے ہیں، اپنے سید ہونے کا احساس ہی انہیں اس کام پر مائل کرتا ہے۔ عہدحاضر میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ تمام مراجع تقلید سید ہیں۔ سابقہ مراجع تقلید میں بعض غیرسادات بھی ملتے ہیں مگر سادات کی نسبت ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ سید جمال الدین اسدآبادی ایک عظیم مسلمان مصلح ہوئے ہیں۔ تقریباً نوے سال قبل وہ حیات تھے۔ ہمارے زمانہ اور ان کے زمانہ میں بہت فرق پایا جاتا ہے، یعنی مسلمان ملت عہدحاضر کی نسبت

ان کے زمانہ میں لمبی تان کر سوئی ہوئی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ وہ اکثر اسلامی ممالک میں گئے اور ہر جگہ کام کیا، اپنی قومیت کو ظاہر نہ کرتے تھے۔ وہ یہ نہ بتاتے کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں۔ جیسا کہ ایرانی محققین نے تحقیق کی ہے اور ظاہراً ان کی تحقیق درست معلوم ہوتی ہے، یہ بزرگ ایرانی تھے وہ جہاں بھی جاتے یہ نہ کہتے کہ میں ایرانی ہوں، کیونکہ اگر وہ یہ کہہ دیتے تو عرب یا افغانی ان کے خلاف ہوجاتے اور کہتے کہ ہم ایک ایرانی کی بات کیوں مانیں؟ خصوصاً اگر وہ اہل سنت کو بتا دیتے کہ میں ایرانی اور شیعہ ہوں تو ان کا کام ہرگز آگے نہ بڑھتا۔ یہ بات قابل عمل نہیں مثال کے طور پر کوئی شخص ایران سے مصر جائے اور کہے کہ میں ایران سے آیا ہوں، شیعہ ہوں، مصر کے تمام علما میری مدد کریں اور میرے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ لہٰذا وہ عموماً کہا کرتے تھے کہ میں افغانی ہوں، کیونکہ عرصہ دراز تک وہ افغانستان میں سکونت پذیر رہ چکے تھے۔ چونکہ اکثر افغانی اہل سنت تھے اس لیے (اہل مصر) کے دلوں میں دشمنی کا احساس پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم وہ بدگمان ہوکر یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ شخص ہمارے دین سے بہکانے کے لیے آیا ہے۔ وہ دستخط بھی مختلف طرح سے کرتے تھے جس زمانہ میں مصر میں ہوتے تو انہی کی طرح دستخط کرتے تھے اور جب افغانستان میں ہوتے تو افغانی طرز پر دستخط کرتے تھے۔ مگر جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، ایک چیز ایسی تھی جس سے وہ کبھی بھی دستبردار نہ ہوئے، اس لفظ کو ہمیشہ اپنے دستخط میں لکھتے تھے اور وہ لفظ ''حسینی'' تھا۔ وہ جمال الدین حسینی کے طور پر دستخط کرتے تھے۔ وہ خصوصی طور پر چاہتے تھے کہ لوگ جان لیں کہ وہ حسین ابن علی کی اولاد سے ہیں۔ وہ واقعی سید تھے اور محسوس کرتے تھے کہ ان کی رگوں میں حسین ابن علی کا خون دوڑ رہا ہے۔

پس خمس کے بارے میں اسلام کے احکام و قوانین کے مطالعے اور آیت انفال و آیت خمس کو ایک دوسری کے ساتھ ملانے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جیسا کہ اہل تشیع کا کہنا ہے، خمس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ایک محدود اور معمولی اہمیت کا مسئلہ اور جہاد کی فروعات میں سے ہو جیسا کہ اہل سنت قائل ہیں۔ اسلامی فقہ نے اس باب میں سادات کو کسی قسم کی اقتصادی برتری سے مخصوص نہیں کیا۔ اسلام کی توجہ فقط سادات کی نفسیاتی کیفیت کی جانب ہے کہ وہ اپنے نسب کو محفوظ رکھیں جیسا کہ وہ محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ عموماً سادات جانتے ہیں کہ ان کا سلسلہ نسب کن پشتوں سےپیغمبراکرم تک پہنچتا ہے۔ اسلام اس نفسیاتی کیفیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، جیسا کہ اس نے فائدہ حاصل کیا بھی ہے۔ جان لو کہ جو نفع بھی تمہیں حاصل ہو

اس کے پانچویں حصے کے تم مالک نہیں ہو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّـمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وہ اللہ ، پیغمبر اور قرابتداروں کا حصہ ہے۔

یہ جو آیت میں پیغمبراکرم کا نام لیا گیا ہے تو شیعہ و سنی دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ خمس نبی اکرم کے عہد تک محدود نہیں، بلکہ نبی اکرم کے بعد کے زمانہ سے بھی متعلق ہے اور چونکہ پیغمبراکرم کو دنیا سے اٹھ جانا تھا، لہٰذا یہ پتہ چلتا ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ خمس پیغمبراکرم کی ذات پر خرچ کیا جائے۔ ایک حصہ ذی القربی یعنی پیغمبراکرم کے قرابتداروں کا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے ذوالقربی نہیں کہا بلکہ ’’ذی القربی‘‘ کہا ہے۔ جیسا کہ ہماری احادیث میں بیان ہوا ہے ذی القربی سے مراد معصومین علیہم السلام ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید کا ایک خاص نقطہ نظر ہے۔ وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۰ یعنی یتیم سادات، مسکین سادات اور تہی دامن مسافر سادات، ان کا خرچ اسی میزانیہ سے دینا چاہیے۔ یہ نہیں اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اس پر جو ہم نے بدر کے دن اپنے بندہ پر نازل فرمایا تھا، یعنی اس عظیم دن جب حق و باطل جدا ہوگئے، باطل بھی پہچانا گیا اور حق بھی۔ یہ اشارہ ہے ان آیات کی طرف جو بدر کے روز نازل ہوئیں کیونکہ ان آیات کی شان نذول غزوہ بدر کے بعد سے تعلق رکھتی ہے۔ غزوہ بدر اگرچہ فوجی، اقتصادی اور لشکریوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک معمولی سی جنگ تھی مگر چونکہ معاشرتی و معنوی اعتبار سے تاریخ دنیا کی چار جنگوں میں سے ایک ہے، اس لیے اسلام اس کو غیرمعمولی اہمیت دیتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اس دن کو یوم الفرقان کے نام سے یاد کیا ہے، یعنی وہ دن جس میں حق و باطل ایک دوسرے سے الگ ہوگئے، یعنی باطل بھی پہچانا گیا اور حق بھی۔ اس دن پتہ چل گیا کہ ایک ایسی طاقت موجود ہے کہ اگر قوت حق صحیح راستے پر گامزن ہو تو وہ طاقت اس کو فتح عطا کرتی ہے، چاہے باطل کی قوت زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيءٍ قَدِيْر اللہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ قادر ہے کہ منظر اس طور پر دکھائے کہ جس کے نتیجہ میں اللہ کے راستے پر گامزن مخلص، لیکن کمزور مادی قوت کو اس طاقتور مادی قوت پر فتح عطا فرمائے جو باطل کے راستے پر گامزن ہے۔

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

ساتویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن صراحت کے ساتھ بیان فرما رہا ہے کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے طرفین کو قوی دل بنانے کا سامان بہم پہنچایا تاکہ فیصلہ کن جنگ واقع ہو اور اس میں صاحبان ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ اس کاانتظام یہ ہوا کہ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے تو مسلمانوں کو کفار بہت تھوڑے دکھائی دئیے۔ کفار تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں تھے لیکن مسلمانوں کو اس سے کم دکھائی دئیے۔ مسلمانوں کو حوصلہ ہوا کہ کفار کی تعداد تو بہت قلیل ہے۔ ادھر کفار نے بھی جب مسلمانوں کو دیکھا تو وہ صحیح تعداد سے بہت کم دکھائی دئیے۔ لہٰذا مسلمان اپنی جگہ کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں، ہم ان کو یقیناً شکست دے دیں گے۔ کفار نے بھی کہا کہ مسلمان تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارا ایک لقمہ بنیں گے۔ یہ بجائے خود ایک نفسیاتی کیفیت تھی۔ چنانچہ لڑنے کے لیے کفار کے دل اپنی جگہ قوی ہوگئے اور مسلمانوں کے اپنی جگہ۔ عجیب تر بات یہ ہوئی کہ دست بدست لڑائی یعنی جنگ مغلوبہ شروع ہونے کے بعد کفار کا تصور بالکل ہی پلٹ گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی قلیل نہیں ہے بلکہ وہ تو بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد مسلمان ان کو اصل تعداد سے دوگنا نظر آنے لگے اور یہی بات کفار کے حوصلے پست ہونے کا موجب بنی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک راز الٰہی تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ حقیقت منصہ شہود پر جلوی گر ہوجائے اور لوگ ہمیشہ اس درس کو یاد رکھیں۔

زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ جنگ سے ایک رات قبل پیغمبراکرم خواب میں دشمن کا لشکر دیکھتے ہیں۔ خواب میں بھی یہ لشکر اس تعداد سے کم دکھائی دیتا ہے جس کا بیداری کے عالم میں آپ نے مشاہدہ فرمایا تھا۔ خواب میں یہ لشکر آنحضرت کو بہت کم دکھائی دیا، لہٰذا جب آنحضرت نے صحابہ کرام کو اپنا خواب سنایا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں دے دل جمعی کے ساتھ کفار پر حملہ کیا اور کفار نے بھی ابتدا میں شجاعت ہی کے ساتھ مسلمانوں پر دھاوا بولا۔ مگر بعد میں ان کے حوصلے پست ہوگئے اور انہوں نے ہزیمت اٹھائی۔ باوجودیکہ کفار کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے تقریباً تین گنا تھی، ان کا

جنگی سازوسامان اور سامان رسد وغیرہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ اس سے مسلمانوں کے جنگی سازوسامان اور سامان رسد کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان دو باتوں کو بیان فرما رہا ہے کہ ہم نے کس طرح ایسا سامان کیا۔ ارشاد ہوتا ہے: اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا۰ (انفال:۴۳) اے رسول! یاد کیجیے وہ وقت جب اللہ نے تمہیں خواب میں ان (کفار) کو کم دکھلایا تھا اور آپ نے بھی یہی خیال کیا تھا کہ وہ بس یہی ہیں۔ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ(انفال:۴۳) اور اگر اللہ تمہیں خواب میں ان کو زیادہ دکھلاتا تو تم بھی چاروناچار اسی حقیقت کو بیان کرتے جو تم خواب میں دیکھتے، ہمت ہار بیٹھتے۔ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ (انفال:۴۳) اور تم آپس میں اختلاف کرنے لگتے یعنی بعض کہتے کہ ہر چند وہ زیادہ ہیں تاہم ہمیں آگے بڑھنا چاہیے اور بعض کہتے کہ اب جب کہ وہ اتنے زیادہ ہیں تو ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ۰ (انفال:۴۳) مگر اللہ تعالیٰ نے تم کو بچالیا۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۴۳ (انفال:۴۳) بلاشبہ اللہ اس بات سے آگاہ ہے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے۔ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا (انفال:۴۴) اور جب تمہارا ان کے ساتھ مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری آنکھوں میں ان کو بہت کم کرکے دکھلایا۔ وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ (انفال:۴۴) اور ان کی نظروں میں تم کو تھوڑا کردیا۔ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۰ (انفال:۴۴) تاکہ اللہ کو جو کچھ منظور ہے وہ پورا ہوجائے اور اللہ کی حتمی قضا یہی ہے کہ اس کام کو کرے اور اسے اس ذریعہ سے انجام دے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۴۴ (انفال:۴۴) اور تمام کام اللہ کی جانب ہی لوٹائے جاتے ہیں۔

ان آیات کے بعد چند ایسی آیات ہیں جن میں جہاد کے آداب بیان ہوئے ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۴۵ (انفال:۴۵) اے صاحبان ایمان جب تم میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرو تو ثابت قدمی سے کام لو، اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ پس پہلا حکم ثابت قدم رہنے کا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۴ (صف:۴) اللہ ان لوگوں کوپسند فرماتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اس طرح صفیں باندھتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔

یہاں بھی پہلا حکم ثابت قدمی کا ہے۔ خیال رکھو کہ کہیں تمہارے حوصلے پست نہ ہوجائیں کہ تم جنگ سے بھاگ کھڑے ہو۔

وَاذْكُرُوا اللہَ كَثِيْرًا (انفال:۴۵) اور اس عالم میں اللہ کو بہت یاد کرو۔ اسے فراموش نہ کرو۔

اللہ کی یاد انسان کی قوت قلب کا سبب ہے خصوصاً جب انسان مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اس وقت اللہ کی یاد یعنی اللہ سے کمک طلب کرنے سے انسان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ يٰٓاَيُّہَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ۰ (بقرہ:۱۵۳) اے ایمان لانے والو! اللہ سے مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔ نماز اللہ کا ذکر ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ نماز کےذریعہ مدد طلب کرو۔ مجھے یاد ہے کہ کئی سال پہلے ایک شخص، جو کبھی طالب علم ہوا کرتا تھا، تہران میں آکر درباریوں میں شامل ہوگیا۔ اس نے مذہب شیعہ کی رد میں کتاب لکھی۔ ہم نے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب میں اس نے ذکر خدا کا تمسخر اڑایا تھا اور لکھا تھا کہ کیا یہ بہتر ہے اور اللہ اس بات سے زیادہ راضی ہوتا ہے کہ ایک پہرہ دار رات کے وقت لوگوں کے گھروں پر پہرہ دےیا یہ کسی جگہ بیٹھ جائے اور ہونٹ ہلاتا رہے اور کہے کہ میں ذکر خدا میں مصروف ہوں؟ ایک عالم نے اس کا بہت اچھا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب پہرہ دار کے کاندھے پر بندوق ہو، وہ سڑکوں پر چکر لگا رہا ہو اور پہر دے رہا ہو، اسی عالم میں وہ اللہ کو یاد کرے۔ اسلام یہ تو نہیں کہتا ہے کہ یا پہرہ دو یا خدا کو یاد کرو، پائلٹ بنو یا خدا کو یاد کرو، ناخدا بنو یا خدا کو یاد کرو۔ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ تم جو کام بھی کرو اس میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنا کام بہتر طور پر انجام دے سکو گے اور تمہارا حوصلہ بھی بلند رہے گا۔ تم یہ سوال کیوں کرتے ہو کہ کیا یہ بہتر ہے کہ ایک پہرہ دار گھروں پر پہرہ دے یا یہ کہ وہ ہزار دانوں کی ایک تسبیح ہاتھ میں پکڑے ہوئے کسی کونے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتا رہے! گویا قرآن نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی یاد سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان چلہ کشی کرے، گوشہ نشین ہوجائے درودیوار بند کرلے اور ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں لے کر ذکر میںمشغول رہے۔ قرآن مجاہدین سے فرما رہا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللہَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۴۵ (انفال:۴۵) اے ایمان والو! جب تمہیں دشمن کا سامنا ہو اور موت تمہارے سامنے کھڑی ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد رکھو۔ قرآن نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ ''ثابت قدم رہو کہ یہ خدا کو یاد کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ''اپنے گھروں کو لوٹ جائو اور وہاں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے رہو، بلکہ فرمایا ہے کہ ''ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو۔ اگر میدان جنگ میں اللہ کو یاد کرو گے تو زیادہ ثابت قدم رہو گے اور اسی صورت میں فتح و کامرانی تمہیں نصیب ہوگی۔''

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا۰ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۝۴۶ۚ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۰ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۝۴۷ (انفال:۴۶۔۴۷) اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (ورنہ) تم ہمت ہار دوگے، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور جنگ کی تکلیف کو جھیل جائو (کیونکہ) اللہ یقیناً صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں جیسے نہ ہوجائو جو اتراتے ہوئے، لوگوں کو دکھلانے کے واسطے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور جو کچھ بھی وہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس پر (ہر طرح سے) احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہاں قرآن آداب جہاد کو بیان فرما رہا ہے۔ دو باتیں تو ہم بیان کرچکے، ایک یہ کہ ثابت قدم رہو اور دوسرے یہ کہ اللہ کی یاد سے لو لگائے رکھو۔ تیسرے یہ کہ: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اللہ اور اس کے رسولﷺ کی اطاعت کرو، یعنی علم و ضبط برقرار رکھو، خود اپنی طرف سے کوئی اقدام نہ کرو، بلکہ دیکھو کہ اللہ کا حکم کیا ہے، پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ پیغمبرؐ کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تمہارے معاملات میں بااختیار ہیں اور یہ اختیارات اللہ نے ان کو دئیے ہیں۔ پس جہاد کے سلسلہ میں تیسری شرط نظم و ضبط ہے جس میں شرعی نظم و ضبط بھی شامل ہے اور عملی بھی۔ شرعی نظم و ضبط سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام پر کماحقہ ، عمل کرنا ہے جبکہ تنظیمی نظم و ضبط یہ ہے کہ اپنے فرمانروا کے احکام کو، جس کو اللہ نے حاکم مقرر فرمایا ہے، حکم ملتے ہی مکمل طور پر بجالائو۔ چوتھے یہ کہ وَلَا تَنَازَعُوْا کوشش کرو کہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرو کیونکہ یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ جھگڑا مت کرو کیونکہ اگر آپس میں جھگڑنے لگو گے تو فَتَفْشَلُوْا سستی و کم ہمتی کا شکار ہوجائو گے۔ باہمی اختلاف اور جھگڑے ہمت ہارنے کاموجب بنتے ہیں۔ تمہیں دشمن کے سامنے سختی سے بند مٹھی کی مانند ہونا چاہیے۔ جب تم آپس میں لڑنے اور اختلاف کرنےلگو گے تو جو قوت دشمن کے خلاف استعمال ہونی چاہیے وہ تمہارے اپنے اختلاف میں صرف ہوجائے گی۔

ذرا غور کریں کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات ان پر کیسے مصائب کا باعث بن چکے ہیں؟ فلسطینی اردنی کوموت کے گھاٹ اتار رہا ہے اور اردنی فلسطینی کو۔ مجھے اس چیز کا تجربہ ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہماری جتنی قوت اسلام کی خدمت کے لیے اور اسلام دشمنوں کے خلاف استعمال ہونا چاہیے تھی اس سے کئی گنا قوت خود ہمارے اپنے آپ کو کچلنے کے لیے استعمال ہورہی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: وَلَا تَنَازَعُوْا نزاع نہ کرو۔ فَتَفْشَلُوْا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم ہمت ہار بیٹھو گے۔ تمہارے پائے

ثبات میں لغزش آجائے گی۔ وَتَذْہَبَ رِیْحُکُمْ تمہاری عزت و غلبہ و دولت کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ دولت، قوت اور غلبہ کی ہوا آپس کی پھوٹ کے باعث رک جائے گی کیونکہ باہمی پھوٹ ہمت ہارنے کا موجب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں پست ہمتی تمہاری عزت، دولت اور غلبہ کی شہرت کو ختم کرڈالے گی۔ اسی لیے کم ہے کہ آپس میں جھگڑاونااتفاقی مت کرو۔

وَاصْبِرُوْا اس کے برعکس صبر سے کام لو، مستقبل سے امیدیں وابستہ رکھو، جان لو کہ شکیبائی کی کوکھ سے کامیابی و کامرانی جنم لیتی ہے۔ اِنَّ اللہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یعنی اگر انسان صبر سے کام لے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِہِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ۰ۭ وَاللہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ۴۷ (انفال:۴۷) اور ان لوگوں جیسے نہ ہوجائو جو اتراتے ہوئے، لوگوں کو دکھانے کے واسطے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور جو کچھ بھی وہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس پر (ہرطرح سے) احاطہ کیے ہوئے ہے۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ بااخلاص بنو۔ عظیم اسلامی ہدف کو سامنے رکھ کر کام کرو۔ نام و نمود، ساتھیوں کے سامنے نمائش اور تجمل پرستی سے اجتناب کرو۔ ان لوگوں جیسے نہ بنو جو’’بطر‘‘ یعنی دکھاوے کے طور پر اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں۔ ’’بطر‘‘ اس بری نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جو کسی نعمت کے ملنے پر انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک فوجی جنگ کے لیے جانا چاہے تو اس کی کوشش ہو کہ اس کے پاس بہترین جنگی لباس ہو، اس کے پائوں میں بہترین جوتا ہو اور اس کے سینے پر بہترین تمغہ جات لگے ہوں متعدد نشانات افتخار ان کے ساتھ آویزاں ہوں، ان سب چیزوں سے لیس ہوکر وہ اتراتا ہوا گھر سے باہر آتا ہے۔ ایسے نہ بنو۔ ریاکار نہ بنو بلکہ اپنے ہدف کے ساتھ مخلص رہو۔ رسول اکرمؐ نے کیا خوب فرمایا ہے: ’’جوشخص جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو اس کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ میدان جنگ میں جاکر شجاعت کا مظاہرہ کرے ، دشمن کے بہت سے افراد کو تہ تیغ کرڈالے۔ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس مجاہد نے جہاد میں حصہ آخر کیوں لیا ہے؟ اگر وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کے لیے آیا ہے تو اس کا جذبہ قابل قبول ہوگا۔ لیکن اس کا پتہ کیسے چلے کہ اس نے صرف مال غنیمت کی خاطر جہاد میں حصہ نہیں لیا ہے؟ اس کا کیسے پتہ چلے کہ اس نے اس امید کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیا کہ کوئی قیدی عورت اس کے حصے میں آئے گی؟ جو شخص ان

مقاصد کو سامنے رکھ کر جہاد میں حصہ لیتا ہے اس کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے اور وہ اس سے بلند تر مرتبہ پر فائز نہیں ہوسکتا۔'' وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِہِمْ بَطَرًا وَّرِئَا۬ءَ النَّاسِ یعنی نعمات غنیمت سے بہرہ مند ہونے کی خاطر اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلانے کے لیے، اپنے گھروں سے جہاد کے لیے باہر نکلتے ہیں یا ان کا مقصد محض ریاکاری ہوتا ہے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللہِ۰ۭ ایسے لوگ دراصل لوگوں کے لیے اللہ کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ وَاللہُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یعنی ایسے اعمال کو قبول نہیں فرماتا۔ جو اچھا کام اللہ کے لیے کیا جاتا ہے اس میں اور اس اچھے کام میں جو غیرخدا کے لیے کیا جاتا ہے یہ فرق ہے کہ غیرخدا کے لیے کام کرنے والا شخص کہتا ہے کہ فلاں کام ہونا چاہیے، خواہ کچھ بھی ہو۔ مثلاً کوئی شخص اپنے دشمن کی سزا کے لیے کسی کو اس کی طرف بھیجتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کو خوب سزا دے کر آئے ہو؟ کیا تم نے اس کو اس قدر مار لیا ہے کہ اب اسے دوبارہ بولنے کی ہمت نہ ہو؟ وہ اس شخص سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے یہ کام کس مقصد کے پیش نظر انجام دیا ہے! لیکن اللہ کا کام ایسا نہیںہے۔ سب سے پہلے اللہ انسان کے مقصد کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

وصلی اللہ علی محمدوآلہ الطاہرین

آٹھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِہِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللہِ ۰ۭ وَاللہُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۴۷ وَاِذْ زَيَّنَ لَہُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ۰ۚ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْہِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْ اَرٰي مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللہَ ۰ۭ وَاللہُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۴۸ۧ (الانفال:۴۷۔۴۸)

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے: (اے مسلمانو!) ان لوگوں کے مانند نہ ہوجائو جو اتراتے ہوئے نمائش کے طور پر ریاکاری اور دکھاوے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، یہی لوگ دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اللہ ان کے کاموںپر کامل احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس آیت میں سابقہ دو آیات میں بیان کردہ بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔ ہم یہاں ان دو آیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں تاکہ اس آیت کا مفہوم واضح ہوسکے۔ ان تینوں آیات میں مسلمان مجاہدین کو یہ آداب سکھائے جارہے ہیں کہ اے مسلمان مجاہدو! جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو اور جہاد پر آمادہ ہو تو ان آداب کو بجالائو۔ پہلے ان نکات پر توجہ مبذول فرمائیں جو یہاں بتائے گئے ہیں، اس کے بعد ان احکامات کا، جو اسلام نے مسلمان مجاہدین کو دئیے ہیں، موازنہ ان احکامات کے ساتھ کریں جو عموماً افواج کے لیے جاری کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً جذبات کے ان پہلوئوں پر غور کریں جن کے ساتھ اسلام مجاہدین کے جذبات کو جہاد کی سمت میں آراستہ کرتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانی تربیت عموماً لشکریوں کے جذبات کو کس راہ پر لگاتی ہے! البتہ بعض چیزیں دونوں میں مشترک ہیں۔ ہم ان امور کو بھی بیان کریں گے جو دونوں صورتوں میں مشترک ہیں اور دونوں کی امتیازی خصوصیات کو بھی بیان کریں گے۔

اس آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ: يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا (انفال:۴۵) جب دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوجائے تو ثابت قدم رہو۔ ثبات قدم اور ڈٹے رہنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اپنے لشکریوں کو یہی حکم دیتے ہیں۔ مجاہد کو ایسا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ

ہو تو وہ مجاہد بن ہی نہیں سکتا۔ البتہ ادیان عالم میں یہ اسلام ہی کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو قوت و قدرت کی دعوت دیتا ہے۔ مشہور مورخ ویل ڈیورنٹ نے ایک کتاب ''تاریخ تمدن'' لکھی ہے۔ اس کے اکثر حصوں کا فارسی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ فارسی ترجمہ کی گیارھویں جلد میں اس نے اسلامی تمدن پر بحث کی ہے۔ جس کو کسی نہ کسی طرح اس نے اسلام سے مربوط کیا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح اپنے پیروکاروں کو قوت و قدرت کی طرف رغبت نہیں دلائی۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا جب دشمن کی کسی جماعت سے تمہارا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور دشمن کو پیٹھ نہ دکھائو۔

اس موضوع پر بہت سی قرآنی آیات ہیں۔ مثلاً سورہ مبارکہ صف میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۴ (صف:۴) اللہ ان لوگوں کوپسند فرماتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کو گرایا نہیں جاسکتا۔ ہمارے اپنے قدیم انسانوں میں آتا ہے کہ اسفندیار کو ''روئین تن'' (آہنی بدن والا) کا لقب دیا گیا تھا۔ وہ کسی شخص کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ آہنی بدن کا مالک ہے، یعنی اس کے بدن کو تیر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں قرآن مجید ایک جماعت کے بارے میں فرما رہا ہے۔ قرآن افسانوی انداز میں آہنی، سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں کہہ رہا۔ بلکہ فرما رہا ہے کہ گوشت و پوست کی بنی ہوئی یہ دیوار اس طرح اپنی جگہ پر جمی رہتی ہے گویا یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ اسی طرح ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ۰ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ۰ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا۰ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۱۴۶ (آل عمران:۱۴۶) یعنی ''ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں‌جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والوں نے (راہ خدا میں) جہاد کیا اور پھر ان کو اللہ کی راہ میں جو مصیبت آئی تو نہ ہی انہوں نے ہمت ہاری، نہ ہی بودا پن دکھایا اور نہ ہی (دشمن کے سامنے) گڑگڑانے لگے۔ اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

سب سے پہلا حکم ثابت قدمی ہے جس کازیادہ تر تعلق اس ارادہ سے ہے جس کو انسان دشمن کا سامنا کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔ ارشاد ہورہا ہے کہ خوفزدہ نہ ہو، ثابت قدم رہو۔ دوسرے یہ کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

اسی عالم میں اللہ کو کثرت سے یاد کرو یعنی جو نعرے لگائو وہ خدائی نعرے ہوں۔ اس کام کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ جب انسان اللہ کو یاد کررہا ہوتا ہے تو اس کا دل قوی ہوجاتا ہے۔ حقیقت میں یہ حکم پہلے حکم کی، جو ثابت قدم رہنے سے متعلق ہے، تائید کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی یاد انسان کو ہر طرح نفسانی خواہشات سے محفوظ رکھتی ہے۔ یعنی تم اللہ کے لیے جگن کررہے ہو لہٰذا اللہ کی یاد سے لو لگائو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی جنگوں میں ہمیشہ الٰہی نعرے لگاتے تھے۔ اب بھی عرب لشکری کم و بیش اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں اگرچہ آیت میں یہ نہیں ہے کہ تم اللہ اکبر کا نعرہ لگائو۔ آیت تو کہتی ہے کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ ہر وہ ذکر مناسب ہے جو اللہ کا ذکر شمار ہوتا ہو خصوصاً وہ اذکار جن میں اللہ سے مدد طلب کی گئی ہو۔

تیسرا حکم : وَاَطِیْعُوا اللہَ وَرَسُوْلَہٗ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس حال میں اسلام کے احکام پر پورے طور پر عمل کرو۔ ہرگز ظلم نہ کرو۔ اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے: قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللہِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا۰ (بقرہ :۱۹۰) یعنی ''جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں تم بھی ان سے جنگ کرو اور ظلم نہ کرو۔'' اسلام جو احکام دیتا ہے، جو اللہ کی جانب سے پیغمبراکرم پر نازل ہوتے ہیں، ان کو اپنا نصب العین بنائو اور پیغمبراکرم کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تمہارے سردار، آقا اور قائد ہیں۔ یعنی عسکری نظم و ضبط برقرار رکھو۔ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْہَبَ رِيْحُكُمْ (انفال:۴۶) باہمی اختلاف اور آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ آپس میں نہ لڑو۔ یہ تو بدرجہ اولیٰ نہیں کرنا چاہیے۔ جب اردن و فلسطین کے لوگ ایک دوسرے کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے لگیں گے تو اس میں دشمن کی کامیابی ہے۔ وَلَا تَنَازَعُوْا آپس میں مت جھگڑو، فَتَفْشَلُوْا کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے ذہن مفلوج ہوجائیں گے اور اس جسم کی مانند ہوجائو گے کہ جب اس کا توازن ختم ہوجاتا ہے تو وہ بیماری کی زد میں آجاتا ہے، اس میں خون کے سفید جرثومے (White Globules) جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ سست پڑجاتا ہے اور اس کی قوت مدافعت جاتی رہتی ہے۔ پھر جب تم کاہل ہوجائو گے وَتَذْہَبَ رِيْحُكُمْ (تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی) فارسی زبان میں ریح کے معنی ''باد'' کے ہیں لیکن ''ریح'' فارسی زبان کے لفظ ''باد'' میں بہت فرق ہے، یعنی عربی زبان میں ''ریح'' سے بہت سے دیگر الفاظ بنائے گئے ہیں جبکہ ہم ہوا کی حرکت کو ''باد'' کہتے ہیں اور اس لفظ سے ہم نے دوسرا کوئی لفظ نہیں بنایا جبکہ عربی زبان میں ''ریح'' سے اور بہت سے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ ''رائحہ'' کا لفظ جو خوشبو کے معنی دیتا ہے، اسی لفظ سے مشتق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خوشبو ہوا میں پھیل جاتی ہے اور ہوا

حرکت سے انسان تک پہنچتی ہے۔ لفظ روح اسی مادہ سے مشتق ہے۔ فارسی زبان میں لفظ ''باد'' کو بعض اوقات کنایہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً جب ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص جاہ و جلال کا مالک اور اختیار بدست و مختار ہے، تو اس وقت ہم کہتے ہیں باد بہ پرچم فلانی می وزدہ (اردو زبان میں اس کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے ''فلاں شخص کی ہوا اکھڑ گئی'' مترجم) اس آیہ مبارکہ میں ''باد'' کے معنی میں جو ریح کا لفظ استعمال ہوا ہے ممکن ہے کہ قدرت و شوکت کے کنایہ کے طور پر ہی بیان ہوا ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم آپس میں جھگڑنے لگو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے رماد رایحہ ہو؟ اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ تمہاری خوشبو ختم ہوجائے گی۔ بہرال دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ پس یہاں یہی حکم دیا جارہا ہے کہ آپس میں نہ جھگڑو کیونکہ اس کے نتیجہ میں سستی و کمزوری پیدا ہوگی جس کی وجہ سے تمہاری شوکت، عظمت اور قوت ختم ہوجائے گی۔ ویل ڈیورنٹ نے ایسے افراد کے لیے بلاوجہ نہیں کہا کہ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح اپنے پیروکاروں کو قوت کی طرف نہیں بلایا۔ دوسرے ادیان میں یہ مسائل واضح ہی نہیں کیے گئے۔ عظمت، شوکت، قدرت اور قوت کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا۔ مگر اسلام چونکہ ایسا دین ہے جو معنوی پہلوئوں کے علاوہ معاشرتی پہلو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اس لیے وہ لامحالہ قوت کو جو معاشرتی اصولوں اور نوامیس میں سے ایک ہے اہمیت دیتا ہے۔

وَاصْبِرُوْا۰ؕ اِنَّ اللہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ دوسرا حکم مسئلہ صبر سے متعلق ہے۔ صبر کے معنی پیش آنے والے مصائب پر جزع و فزع نہ کرنے یعنی ثابت قدم رہنے کے ہیں۔ دشمن کی قوت کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو یعنی خوف نہ کھائو اور بزدلی نہ دکھائو، یعنی جن مشکلات سے چاروناچار تمہیں دوچار ہونا پڑے ان کا سامنا کرتے وقت ثابت قدم رہو۔

میں نے اپنی سابقہ تقریر کی بعض باتوں کو جان بوجھ کر دہرایا ہے اکہ آج رات جس آیت کی تلاوت میں نے کی ہے اس کی وضاحت پورے طور پر کرسکوں۔

قرآن مجید درآنحالیکہ مجاہدین و جانبازوں کو ثبات قدم و اتحاد اور نظم و نسق برقرار رکھنے کا حکم دے رہا ہے، قوت و شوکت کی ترغیب دے رہا ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاق و معنویت کی یاددہانی بھی کررہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کو اس طریقہ پر ابھارنا نہیں چاہتا کہ وہ غروروتکبر کی راہوں پر چل نکلیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ دیکھئے اسلام

مسلمانوں کے جذبات کی کس طرح ہدایت و رہنمائی فرماتا ہے؟ میں یہاں حالات کے درمیان موازنہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات جو میں اب بیان کرنے والا ہوں کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ دنیا میں موجود تمام مکاتب فکر و حکومتیں اپنے فوجیوں کی تربیت کے لیے جن مکاتب، معاشرتی فلسفوں اور عملی طریقوں کا سہارا لیتی ہیں، ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے جانبازوں میں قومی افتخار کا جذبہ پیدا کریں، یعنی ان میں ایک ایسا احساس پیدا کریں جس کی موجودگی میں وہ صرف اپنی ذات اور اپنے ملک کے بارے میں ہی سوچیں۔ وہ اپنے جانبازوں کو یہی سکھلاتے ہیں کہ تم ایسے ہو، تمہارے اکابر ایسے تھے، تم اس قدر عظمت کے حامل ہو اور دوسرے لوگ مقابلتاً کم درجہ ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ مبادا تم ایسے بن جائو، مبادا تمہارے اندر ریاکاری اور تکبر کی صفات پیدا ہوجائیں۔ بطر سے کیا مراد ہے؟

انسان کو جب کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ خوش اور مسرور ہوتا ہے، بلکہ مغرور بھی ہوجاتا ہے، دوسرے کو قابل اعتنا نہیںجانتا، اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ وہ نعمت خواہ کیسی ہی ہو۔ بعض لوگ زیادہ دولت کی وجہ سے متکبر ہوجاتے ہیں، بعض زیادہ طاقت حاصل کرلینے سے مغرور ہوتے اور دوسروں سے بے اعتنائی برتنے لگتے ہی، جب چلتے ہیں تو ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کے پاس قدرت و دولت ہے۔ ایسا شخص جب بات کرتا ہے تو اپنے لہجے کے ذریعے کہہ رہا ہوتا ہے: ''میرے پاس طاقت ہے، میں دولت مند ہوں، میں اہل علم سے ہوں۔'' حتیٰ کہ اس کے دیکھنے کے انداز سے ہی غرور و تکبر نمایاں ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ تم ان جیسے نہ بنو، فتوحات اور کامرانیاں تمہیں بدمست نہ کردیں، تمہیں متکبرومغرور نہ بنادیں اور تمہارے اندر انانیت پیدا نہ کریں۔ اسی لیے قرآن مجید دوسروں کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے ہیں۔

لہٰذا آخری حکم جو قرآن مجید اپنے جانبازوں کو دیتا ہے وہ تواضع کا حکم ہے۔ قرآن مجید یہ نہیں فرماتا کہ تم ایسے نہ بنو، بلکہ حکم دیتا ہے کہ تم ان جیسے نہ بنوجو ایسے ہیں۔ قرآن کہنا چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے ہیں۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِہِمْ بَطَرًا ان لوگوں کی مانند نہ بنو کہ جو اپنے گھروں سے باہر نکلے تو اتراتے ہوئے نکلے۔ یعنی غروروتکبر، بے اعتنائی اور انانیت کے ساتھ باہر نکلے۔ وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ اور ریاکاری و نام و نمود کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکلے۔ ایسے لوگ صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، اللہ کو نہیں دیکھتے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللہِ ۰ۭ اور لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیںَ تم ان جیسے نہ بنو۔

تو آخری حکم جو دیا جارہا ہے وہ تواضع و منکسرالمزاجی کا ہے۔ اس مقام پر قرآن عام انسانی طریقوں سے الگ طرزعمل اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے جانبازوں کے جذبات کو انانیت اور ذاتی و قومی غرور، تکبر و گھمنڈ کی راہ پر لگانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جس طرح اس نے شروع میں کہا تھا کہ اللہ کو یاد کرو، ہمیشہ اللہ و حق کو یاد رکھو، ان انانیتوں سے اجتناب کرو۔ وَاللہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ یہاںبھی اسی طرف اشارہ ہے کہ ان کاموں کی سزا ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی تم اللہ سے ڈرو۔ اللہ کے کام میں استہزا نہیں۔ اللہ واسلام کے کاموں میں اسم، لفظ اور ظاہر موثر نہیں ہیں۔

جب تک مسلمان پیغمبراکرم کے زیرپرچم یا آپ کی سیرت کے پرتو میں اس جذبہ کے تحت جہاد کرتے رہے کہ انہوں نے ایمان کا دامن تھامے رکھا، ثابت قدم رہے، اللہ کو یاد کرتے رہے، ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرتے، اسلامی احکامات پر عمل پیرا رہے، نظم و نسق پر کاربند رہے، جزع و فزع نہ کرتے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں گھمنڈ، نام و نمود، تکبر اور غرور وغیرہ نام تک کو نہ تھا، متواضع تھے جس کے باعث اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان کے لیے پورا ہوتا تھا اور وہ اس سے بہرہ ور ہوتے اور اس کے نتائج سےمستفید ہوتے تھے۔ لیکن بتدریج جانبازوں نے اخلاقی سادگی کا دامن چھوڑ دیا بلکہ عبادات کے سلسلے میں بھی یہی رویہ اختیار کرلیا۔ یہ بات آپ متعدد مرتبہ سن چکے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام مرو میں ولی عہد سلطنت تھے۔ یہ ولی عہدی جبری تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مامون نے حضرت امام رضا کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا تھا جسے آخرکار حضرت نے اس شرط پر قبول فرمایا تھا کہ وہ عملی طور پر کسی کار سلطنت میں حصہ نہیں لیں گے کیونکہ جس طرح حضرت عمل کرنا چاہتے تھے حالات اس کے موافق نہیں تھے۔ اگر آپ اس طرح کام کرتے حالات جن کا تقاضا کرتے تھے، تو آپ کا شمار مامون کے آلہ کار اور نمک خوار افراد میں ہوجاتا اور اس سے زیادہ آپ کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ امام رضا کے اس موقف نے مامون کو اس مقصد سے محروم کردیا جو وہ حضرت کے مقام سے حاصل کرنا چاہتا تھا یعنی حضرت کے اس طرزعمل سے مامون کی سیاست ناکام ہو گئی۔ لوگ دیکھتے تھے کہ حضرت علی ابن موسی الرضا علیہما السلام ولی عہد ہیں۔ مگر کسی کام میں بھی دخل نہیں دیتے طرزِعمل بذات خود مامون کے خلاف ایک عملی احتجاج اور اس کے کاموں کو جائز نہ سمجھنے کے مترادف تھا۔ عیدالاضحی کا دن آیا مامون نے حضرت امام رضا کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ میری بجائے آپ نماز عید پڑھائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے شرط ٹھہرائی تھی کہ کسی کام میں دخل نہیں دوں گا، لہٰذا میں ایسا نہیں کروں

گا۔ مامون نے کہا کہ ایسا نہیں۔ یہ نماز ہے، عبادت ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی کار سلطنت میں حصہ نہیں لیتے ہیں تو آپ کے طرزِعمل سے لوگوں کی آوازیں میرے خلاف بلند ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں علی ابن موسیٰ الرضا کیوں کسی کام میں حصہ نہیں لیتے! درست ہے کہ آپ نے شرط ٹھہرائی ہے، لیکن یہ صرف ایک نماز ہی تو ہے۔ آپ ایک مرتبہ تشریف لے جائیں تاکہ ہمارے خلاف لوگوں کی صدائے احتجاج بلند نہ ہو۔ فرمایا: ''پھر ٹھیک ہے۔ میں نماز کے لیے چلوں گا لیکن اس طرح جیسے میرے جدبزرگوار عمل پیرا یعنی میں قطعی طور پر اس اسلامی طریقے کو اختیار کروں گا جس پر میرے جدبزرگوار عمل پیرا تھے۔ ان رسومات و طریقہ ہائے کار پر عمل نہیں کروں گا جو آج کل رائج ہیں'' مامون نے کہا کہ اس سلسلے میں آپ کو پورا اختیار حاصل ہے۔ پس اعلان ہوگیا کہ عیدالاضحی کی نما زعلی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام پڑھائیں گے۔تقریباً ڈیڑھ سو سال سے (یعنی معاویہ کے عہد سے لے کر مامون کے دور تک) یہ رسم چلی ااریہ تھی کہ خلفا جلال اور شکوہ و جبروت کے ساتھ باہر آتے تھے۔ لوگ بے خبری میں سمجھے کہ ولی عہد سلطنت بھی اسی جلال و جبروت کے ساتھ باہر آئیں گے۔ بنی عباس کے فوجی سالار، سرکردہ افراد اور ملک و فوج کے اعلیٰ عہدہ دار، جو اس زمانہ میں شاہزادوں کے برابر سمجھے جاتے تھے، سب حضرت ؑ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کے لیے حضرت کے دردولت پر حاضر ہوگئے۔ وہ حسب معمول اپنے گھوڑوں پر زین ڈالے، ہتھیار سجائے، گھوڑوں کی گردنوں میں سونے چاندی کے ہار ڈالے ہوئے تھے۔ انہوں نے خود بھی خاص قسم کے فوجی جوتے پہنے ہوئے تھے، مسلح تھے اور عجیب جلال و جبروت کو ظاہر کرنے والی مرصع تلواریں کمروں میں لٹکائے ہوئے تھے۔ لیکن حضرت پہلے ہی فرما چکے تھے کہ میں اپنے جدبزرگوار کی مانند باہر نکلوں گا۔ آپ نے گھر میں موجود اپنے اعزا سے فرمایا کہ جیسے میں کہوں ویسے ہی عمل کرنا۔ چنانچہ آپ نے وضو کیا اور نماز کے لیے تیار ہوگئے۔ حضرت نے انتہائی سادگی کے ساتھ برہنہ پا ہوکر کمر باندھی، عصا تھاما اور اللہ اکبر اللہ اکبر علی ما ہدینا ولہ الشکر علی ما اولینا پڑھتے ہوئے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ والے بھی آپ کے ساتھ ہم صدا ہوئے۔ باہر سب انتظار میں تھے۔ دروازہ کھلا تو دفعتاً سب نے دیکھا کہ امام ان افراد کے ساتھ باہر نکلے ہیں، اللہ اکبر! سب نے بے اختیار کہا اللہ اکبر! لوگ گھوڑوں سے اتر آئے، ان کو چھوڑ دیا اور لباسوں کو پھاڑ ڈالا۔ انہوں نے جوتے اس طرح پہنے ہوئے تھے کہ پائوں سے اتر نہیں رہے تھے۔ مورخین کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوش قسمت وہ تھا۔ جسے جوتے کو کاٹنے اور دور پھینکنے کے لیے چاقو مل جاتا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو امڈ ااائے۔ اب تک انہیں توقع تھی کہ امام مادی و دنیوی جلال و جبروت و زروزیورو اسپ و شمشیر کے ساتھ

تشریف لائیں گے۔ لیکن وہاں تو اس کے برعکس معنوی دبدبہ و جلال نے اس شان و شوکت کی جگہ لے رکھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

عورتیں اور بچے ولی عہد کا جلال دیکھنے کے لیے چھتوںپر جمع ہوگئے تھے۔ لیکن انہوں نے تو سماں ہی بالکل بدلا ہوا پایا۔ مورین لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہی پورا شہر مرو اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ شہر میں آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شان و شکوہ میں کئی گنا اضافہ ہوا، مگر سادگی و معنویت کے عالم میں عیدگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ (چونکہ یہ عمومی نماز ہے، مستحب ہے کہ زیرآسمان پڑھی جائے) لوگ اس طرح ٹوٹے پڑرہے تھے اور اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کررہے تھے گویا زمین و آسمان میں زلزلہ آگیا ہو۔ مامون کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ حالات نے یہ رخ اختیار کرلیا ہے کہ اگر علی؁ ابن موسیٰ؁ الرضا؁ نے آج نماز پڑھا دی تو تمہارے اختیار میں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اگر وہ اسی مقام پر لوگوں سے کہہ دیں کہ مامون کا رخ کرو تو تمام لشکری تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی، لہٰذا ان کا راستہ روک لو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت؁ کے پاس آخر التجا التماس کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ تھک جائیں گے، آپ کو ایذا ہوگی، لہٰذا خلیفہ کا کہنا ہے کہ میں آپ کو زحمت دینے پر راضی نہیں ہوں۔ اس طرح انہوں نے امام رضا علیہ السلام کو نماز پڑھانے سے روک دیا۔ حضرت؁ نے فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں اس طریقہ سے باہر آئوں گا جس طرح میرے جدبزرگوار تشریف لایا کرتے تھے اور میرے جد بزرگوار کے آنے کا طریقہ یہی تھا۔

جب اسلامی عبادت کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی، تو ان کے جہاد کا کیا عالم ہوچکا ہوگا! جب اسلامی جہادنے دوسرے مادی حکمرانوں کی صورت اختیار کرلی تو مسلمان حکام بھی بڑی بڑی خطائوں کے مرتکب ہوئے (معاویہ خود ہی خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا کیونکہ اس کام کاآغاز اسی نے کیا تھا) حضرت عمر؁ کے عہدخلافت میں معاویہ شام کا عامل تھا اور بیزانس، (مشرقی روم)، جس کا مرکز موجودہ اسلامبول ہے اور جس کا قدیم نام قسطنطنیہ ہے، کے ساتھ شام کی سرحدیں ملتی تھیں۔ حضرت عمر؁ ایک مرتبہ سنت نبوی؁ کے مطابق جو اس وقت تک باقی تھی، انتہائی سادہ لباس میں آرہے تھے۔ ان کی صرف ایک سواری تھی جو غالباً اونٹ تھا، ایک غلام ہمراہ تھا، وہ باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، کبھی خلیفہ خود اونٹ پر سوار ہوتے اور غلام پیدل چلتا اور کبھی غلام سوار ہوتا اور خلیفہ پیدل چلتے۔ ان کے پاس پانی کی ایک مشک اور تھوڑی سی خشک روٹی

تھی۔ معاویہ اور اس کے لشکری بڑی شان و شوکت کے ساتھ خلیفہ کے استقبال کو آئے تھے۔ خلیفہ اور ان کا غلام دونوں لوگوں کے پاس گزرے جاتے اور بعض لوگ ان سے پوچھتے کہ کیا تمہیں خلیفہ کے مرکب کے بارے میں کچھ علم ہے؟ یہ انہیں کوئی جواب نہ دیتے، یہاں تک کہ وہ معاویہ اور اس ساتھیوں تک پہنچے جو انہیں پہچانتے تھے۔ جونہی حضرت عمر کی نگاہ ان پر پڑی اور انہوں نے ان کا جلال و جبروت کے ساتھ آنا دیکھا تو سواری سے نیچے اتر آئے، اپنا دامن پتھروں سے بھرلیا اور معاویہ کو مارتے ہوئے کہنے لگے: ''یہ تم نے کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟'' لیکن معاویہ اس قدر چالاک، عیار اور زودفہم تھا کہ آخرکار اس نے خلیفہ کو قائل کرہی لیا اور کہا کہ ہم جب بیزانس کے پڑوس میں رہتے ہیں، اسلام کی مصلحت اس کی متقاضی ہے۔ خلیفہ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔

اس طرح حکمرانوں نے معنوی و روحانی شان و شکوہ کو مادی شان و شکوہ میں بدل دیا حالانکہ اصل قوت معنوی شان و شکوہ میں مضمر ہے۔ مسلمانوں کی کامرانی کا راز ان کی معنوی روحانی قوت میں مضمر تھا۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِذْ زَيَّنَ لَہُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ ان جیسے نہ بنو کہ شیطان نے جن کے اعمال کو خوبصورت بنا کر دکھلایا۔ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ ان سے کہا کہ تمہارے پاس بہت طاقت ہے، کوئی طاقت تمہارے مقابلہ میں نہیں ٹھہرسکتی۔ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ۰ۚ میں بھی تمہارا معاون ہوں۔ تم میرے پڑوس اور میری پناہ میں ہو، اس بارے میں مفسرین کے مابین عرصہ دراز سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ شیطان نے ان سے یہ سب کس طور پر کہا، وسوسہ کی صورت میں یا انسانی روپ میں آکر۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے ایک حقیقت کو ملک و فرشتے کے نام سے یاد فرمایا ہے اور ایک حقیقت کو شیطان و جن کے نام سے بیان کیا جاتا ہے کہ عام طور پر فرشتہ انسان کی روح میں اچھی باتیں ڈالنے کی غرض سے اس سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ انسان کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان سے ملک اور فرشتہ تلقین کرتا ہے اور دوسرے کان سے شیطان۔ قرآن میں آیا ہے کہ فرشتہ کوئی دوسری صورت اختیار کرلیتا ہے، یعنی اگرچہ اس کی ذات و جنس جسم سے مبرا ہے تاہم وہ جسمانی شکل اختیار کرسکتا ہے اور وہ انسان کی آنکھوں کے سامنے انسانی شکل میں آتا ہے۔ قرآن روح القدس اور حضرت مریم کے بارے میں فرماتا ہے: فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم:۱۷) (پوری آیت اس طرح فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِہِمْ حِجَابًا۰ۣۚ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْہَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِيًّا پھر جب وہ اپنے سب اعزا کی نگاہوں سے اوجھل ہوکر گوشہ تنہائی میں پنہاں ہوئی تو ہم نے اس کے پاس اپنی روح انسانی شکل میں بھیجی)

شیطان بھی ایسا ہی ہے بعض اوقات وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈال کر اسے بہکا جاتا ہے اور کبھی انسان کے سامنے انسانی شکل اختیار کرکے بھی آجاتا ہے۔

اس آیہ مبارکہ کے سلسلہ میں مفسرین عرصہ دراز سے اختلاف کرتے چلے آرہے ہیں کہ شیطان نے یہ باتیں کفار کے دل میں ڈالی تھیں یا ان کے لیے اس نے انسانی شکل اختیار کی تھی؟ علما نے دونوں طریقوں کو تسلیم کیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی درست ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ شیطان نے انہیں یہ باتیں سکھائیں، چاہے اس نے یہ باتیں ان کے دلوں میں وسوسہ کی صورت میں ڈالی ہوں یا انسان کی شکل اختیار کرکے ان سے یہ باتیں کہی ہوں۔ بہرحال اس نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس بہت طاقت ہے اور اس طرح اس نے ان کو مغرور و متکبر بنادیا اور کہا کہ میں تمہارا معاون ہوں۔ لیکن جب دونوں لشکر مقابل آئے تو شیطان بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک تفسیر کی رو سے انسانی شکل میں ظاہر ہونے والا شیطان بھاگ کھڑا ہوا جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ شیطان نے ان کے دلوں میں جو وسوسے ڈالے تھے، ان میں غرور پیدا کیا تھا اور ان کو قوی دل بنایا تھا، اچانک ان سب پر پانی پھر گیا اور ان کی جگہ بزدلی و خوف نے لے لی۔

فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ جونہی دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ شیطان الٹے پائوں بھاگ کھڑا ہوا اور ان سے بیزاری ظاہر کرنے لگا۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شیطان جو ذریعہ بھی اختیار کرے چاہے وسوسے کو کام میں لائے یا انسانی شکل میں ظاہر ہو، انسان اس کے بہکاوے میں آکر مغرور ہوجاتا ہے، اپنے ہاتھ ظلم و ستم سے آلودہ کرلیتا ہے، آخری لمحات میں تمام شیطانی طاقتیں انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا تم مغرور نہ بنو اور ان جیسے نہ بنو کیونکہ ان کو تو شیطان نے بہکا دیا ہے۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۴۹ (انفال:۴۹) (وہ وقت یاد کرو) جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، کہنے لگے ان (مسلمانوں) کو تو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔

منافقین، دو چہروں والے اور دل کے مریض جو فقط ظاہر کو دیکھتے ہیں مابعد الطبیعاتی اسباب کو نہیں دیکھتے۔ وہ کہتے تھے کہ ان بے چاروں

کو دیکھو کہ ان کے دین نے ان کو مغرور کردیا ہے۔

ہم متعددمرتبہ عرض کرچکے ہیں کہ صدراسلام کی جنگیں خصوصاً جنگ بدر معجزہ سےکم نہیں تھی، یعنی مادی اسباب و طبیعاتی قوت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ پیش گوئی نہیں کرتا تھا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی۔ غزوہ بدر کے بارے میں سب کا خیال یہی تھا کہ مسلمان مغلوب ہوجائیں گے، ہزیمت اٹھائیں اور شکست کھائیں گے۔ ایک گروہ جو خود کو عاقل گردانتا تھا، وہ منافقین پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ منافق اور دو چہروں والے تھے۔ یہ تمسخر اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ ان بے چاروں کو دیکھو ان کو قرآن اور ان کے دین کے وعدوں نے بہکا دیا ہے۔ بے وقوف خودکشی پر اترا آئے ہیں۔ بھلا یہ کہاں جارہے ہیں؟ کس نفری کے ساتھ، کس سازوسامان کے ساتھ، کس طاقت کے ساتھ! یہ تو دشمن کا ایک لقمہ ہی بنیںگے۔ یہ دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ ان کے دین نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جب اللہ کسی کے ساتھ ہو اور وہ اللہ پر توکل کرے تو اللہ کے پیدا کردہ ذرائع کس طرح اس کی مدد کو پہنچتے، حصول مقصد میں اس کے ساتھ تعاون کرتے اور اسے قوی بناتے ہیں۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ (اس کا عطف اپنے سے پہلے پر ہے) یعنی ان لوگوں سے نہ بنو جو اپنے شہر سے اس حالت میں باہر نکلے کہ منافقین ودل کے مریض کہتے تھے۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ جب منافقین کہتے ہیں یہاں ''کہتے ہیں'' ''کہتے تھے'' کے معنوں میں ہے وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ اور وہ کہ جن کے دلوں میں مرض ہے، بیمار دلوں والے (مقصود معنوی بیماری ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے دل مریض ہیں اور انہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن جہاں بھی کہتا ہے فِيْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ تو اس سے نفسیاتی و اخلاقی امراض مراد ہوتے ہیں) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں نفسیاتی اور اخلاقی امراض پائے جاتے ہیں، کہتے تھے غَرَّ ہٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُہُمْ۰ۭ ان کے دین نے ان کو مغرور کردیا ہے۔ بے چارو! تم کس طرف بڑھ رہے ہو اور کس طاقت کے بل بوتے پر! مگر یہ خود اس سے غافل تھے کہ: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ یعنی جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ آپ لوگ اپنے کاموں کے سلسلہ میں توکل کیجیے (توکل سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اپنا فرض بجالائے) اس وقت آپ دیکھیں گے کہ اللہ کس طرح آپ کا ساتھ دیتا ہے: فَاِنَّ اللہَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تو کوئی طاقت اس کے مقابلے میں نہیں ہے، وہ حکم و دانا ہے۔ اس کے تمام کام دانائی اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ بلاسبب کسی کی تائید نہیں فرماتا۔

اس مقام پر وہ آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں جن میں لوگوں کے لیے نفسیاتی و روحانی احکام صادر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت آتی ہے (انفال:۵۰) یہ موعظت ہے اس میں کفار کی اس حالت کو بیان کیا گیا ہے جو قبض روح کے وقت ان پر طاری ہوتی ہے۔ اس پر ہم انشاء اللہ آئندہ تقریر میں بحث کریں گے۔

نویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا۰ۙ الْمَلٰۗىِٕكَۃُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْہَہُمْ وَاَدْبَارَہُمْ۰ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۵۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللہَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۵۱ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ۰ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ۰ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللہِ فَاَخَذَہُمُ اللہُ بِذُنُوْبِہِمْ۰ۭ اِنَّ اللہَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۵۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۰ۙ وَاَنَّ اللہَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۵۳ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ۰ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ۰ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّہِمْ فَاَہْلَكْنٰہُمْ بِذُنُوْبِہِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ۰ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۵۴ (انفال:۵۰۔۵۴)

اور کاش تو اس وقت دیکھے جب فرشتے ان لوگوں کو جو کافر ہوگئے ہیں (دنیوی زندگی سے) پورا پورا لے لیتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے جاتے ہیں اور (کہتے جاتے ہیں) جلانے والا عذاب چکھو۔ یہ (اس کا بدلہ) ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیںہے جس طرح آل فرعون کی اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے ہوئے، حالت ہوئی کہ انہوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، تو اللہ نے انہیںان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑاطاقتور سخت عذاب دینے والا ہے۔ یہ اس لیے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو بدلنے والا نہیں جب تک کہ وہ اپنے نفسوں میں تغیر پیدا نہ کریں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ جس طرح آل فرعون کی اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے ہوئے حالت ہوئی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کیا اور ہم نے آل فرعون کو غرق کردیا۔ اور وہ سب کے سب ظالم تھے۔

جن آیات کی ہم نے تلاوت کی ہے ان میں پہلی آیت کفار کی قبض روح کے وقت بہت بری اور دردناک حالت کو بیان کررہی ہے۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ ان کی کفر کی روح حقیقت کے خلاف عداوت رکھنے سے عبارت ہے کافی میں حضرت امام محمدباقر علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے: کل مایجر الی الایمان والتسلیم فھو الاسلام وکن

مایجر الی الجمود فھوالکفر (کافی ج۲ص ۳۸۷ میں یہ حدیث ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کل شی یجرہ الاقرار و التسلیم فھوالایمان وکل شیئ یجرہ الانکار والحجود فھو الکفر (جو چیز اقراروتسلیم لانے والی ہو وہ ایمان اور جو انکاروتکذیب لائے، وہ کفر ہے) یعنی جس چیز کا نتیجہ یہ ہو کہ جب انسان کا کسی حقیقت سے سامنا ہو اور وہ جان لے کہ یہ حقیقت ہے، اسے تسلیم کرلے، اس کی بازگشت ایمان کی جانب ہوتی ہے اور جس چیز کا نتیجہ یہ ہو کہ جب انسان حقیقت کا سامنا کرے اور جان لے کہ یہ حقیقت ہے، پھر اس کی مخالفت و دشمنی پر اتر آئے، اس کا انکار کرے تو یہ روح کفر ہوگی۔

پیغمبراکرم کی مخالفت کرنے والے کفار کو اللہ تعالیٰ اسی لیے دنیاوآخرت کے عذاب کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ رسول اکرم کون ہیں اور کیا فرما رہے ہیں، آنحضرت سے عداوت برتتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مخالفت اپنے حقیقی معنی میں کفر تھی۔ بہرحال قرآن کریم ان کی جان کنی کا عالم بیان کررہا ہے کہ یہ وقت ان پر کس قدر سخت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ان کے عذاب کا آغاز ہے ارشاد ہوتا ہے: ''اور کاش آپ دیکھیں کہ اللہ کے فرشتے کس طرح کافروں کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہوئے ان سے کہتے ہیں کہ اب دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھو۔''

موت کو ہم ''وفات'' کیوں کہتے ہیں؟

اس آیت میں چند مطالب ہیں جن پر گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم مرنے کو ''توفی'' سے تعبیر کرتا ہے۔ جبکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ فلاں شخص فوت ہوگیا۔ آخر ہم موت کو ''وفات'' کیوں کہتے ہیں؟

فوت کا لفظ جس کو ہم استعمال کرتے ہیں اس مادہ سے مشتق نہیں ہے، بلکہ یہ ''وفات'' کے مادہ سے مختلف ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ''وہ فوت ہوا'' یا اس نے وفات پائی دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ''فوت'' کے معنی اور ہیں اور ''وفات'' کے اور ۔ یہ معنی جو میں نے بیان کیے ہیں ''فوت'' کے معنی نہیںبلکہ وفات کے معنی ہیں۔ قرآن موت کے لیے ''توفی'' کےلفظ کو بیان کرتا ہے اور ''توفی'' وفات سے مشتق ہے ''فوت'' کے لفظ سے نہیں۔ فوت کے معنی ہاتھ سے نکل جانے کے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: ''نماز من فوت شد'' یعنی میری نماز قضا ہوگئی۔ یا کہتے ہیں کہ ''فلاں عمل از من فوت شد'' یا مثلاً ہم کہتے

ہیں کہ فلاں شخص مکہ سے آیا اور میں اس کی ملاقات کو جانا چاہتا تھا لیکن مصروفیت کی بنا پر ''این دید از من فوت شد'' یعنی میں اس کی ملاقات کو نہ جاسکا۔ اب اگر ہم ''موت'' کو ''فوت'' سے تعبیر کریں۔ حالانکہ قرآن مجید یہ تعبیر نہیں کرتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خیال کرتے ہیں کہ مرنے والا ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہمارے بارے میں بھی یہی کیفیت ہے، یعنی جو مرجاتا ہے وہ ہماری پہنچ سے دور نکل جاتا ہے، یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فوت ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری پہنچ سے دور ہوچکا ہے۔ مگر قرآن بارہا ''توفی'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ''توفی'' اور ''وفات'' ی اصل ایک ہی ہے۔ ''توفی'' کا لفظ ''فوت'' کے لفظ سے بالکل برعکس معنی دیتا ہے یعنی ''توفی'' کے معنی کسی چیز پر قبضہ کرنے اور اسے اپنی تحویل میں لینے کے ہیں۔ مثلاً آپ قرض خواہ ہیں اور اپنے مقروض سے اپنا قرض واپس لے لیتے ہیں تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ آپ نے ''استیفا'' کیا ہے۔ استیفا بھی ''توفی'' ہی سے مشتق ہے۔ اگر آپ اپنا تمام قرض واپس لے لیں یعنی یوں نہیں کہ آدھا قرض لے لیں اور آدھا نہ لیں، تو اس کو ''توفی'' کہتے ہیں۔ یعنی اس نے استیفا کیا۔ پس ''توفی'' اور ''استیفا'' کے معنی ہاتھ سے نکل جانے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس اس کے معنی کسی چیز کو کامل طور پر اپنی تحویل میں لے لینے کے ہیں۔ قرآن ہمیشہ موت کو کامل طور پر اپنی تحویل میں لینے سے تعبیر کرتا ہے، لہٰذا فرماتا ہے: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا (زمر:۴۲) یعنی اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ بلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ارواح کو موت کے وقت مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح ایک آیت (آیہ :۱۰) ہے سورہ سجدہ میں: وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں ناپید ہوجائیں گے، (فقط اجسام ان کے مدنظر ہیں)، بکھر جائیں گے، ہمارے جسموں کے ذرات اس طرح بکھر جائیں گے کہ ڈھونڈے سے نہ ملیں گے ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۰ۥ تو کیا ہم دوبارہ خلق کیے جائیں گے، زندہ ہوں گے، اُٹھائے جائیں گے؟ قرآن کہتا ہے بَلْ ہُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّہِمْ کٰفِرُوْنَ (السجدہ :۱۰) بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی حضوری یعنی قیامت ہی کے منکر ہیں۔ ان کو جواب دیجیے: قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (السجدہ :۱۱) (اے رسول) تم کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا، اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جائو گے۔ یعنی کہہ دیجیے کہ تم لوگوں نے غلط سمجھا ہے کہ اس طرح بکھر جانے کو اپنے آپ سے تعبیر کرتے ہو۔ تم وہ نہیں ہو۔ جس چیز کی خاطر اپنے لیے لفظ ''تم'' استعمال کرتے ہو، وہ چیز ہمارا فرشتہ اپنی تحویل میں لے کر جا چکا ہے۔

اس آیہ مبارکہ اور اس جیسی دیگر آیات سے مکمل طور پر بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن موت کو ''فوت'' نہیں بلکہ ''وفات'' فرماتا ہے ''وفات'' سے کسی قدر بلندتر شے ''توفی'' ہے۔ یعنی موت کے معنی ہاتھ سے نکل جانے کے نہیں ہیں، البتہ ہماری نسبت تو معنی ہاتھ سے نکل جانے کے ہی ہیں، لیکن ''توفی'' کے معنی تحویل میں دئیے جانے اور دوسری دنیا میں تحویل میں لینے کے ہیں۔ اللہ کے فرشتے آتے ہیں اور اسے اپنی تحویل میں لے کر چلے جاتے ہیں۔

مسئلہ روح

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید میں مسئلہ روح کا ذکر کہاں آیا ہے جبکہ قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر روح کا ذکر آیا ہے۔ ان مقامات میں ایک تو یہی ہے کہ موت کو ''توفی'' سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی تحویل میں لے لیا اور پورے کا پورا اپنی تحویل میں لے لیا۔ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ انسان روح و جسم کا مرکب ہے اور ہم اس کے نصف کو اپنی تحویل میں لیتے ہیں جبکہ دوسرے نصف کو یونہی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اس کے ٹکڑےٹکڑے ہوجائیں۔ قرآن ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے والے نصف حصہ کو انسان کی شخصیت کا حصہ شمار ہی نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں ''توفی'' کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے اَللہُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِہَا (زمر:۴۲) (اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ لیتا ہے)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ(السجدہ :۱۱) (اے رسولؐ) کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىھُمُ الْمَلٰۗىِٕكَۃُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِہِمْ (النساء:۹۷) بے شک جن لوگوں کی قبض روح فرشتوں نے اس وقت کی ہے کہ (دارالحرب میں پڑے) اپنی جانوں پر ظلم کررہے تھے، یہاں فرما رہا ہے وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا۝۰ۙ الْمَلٰۗىِٕكَۃُ .... (انفال:۵۰) (جب فرشتے ان لگوں کو جو کافر ہو گئے ہیں، پورا پورا لے لیتے ہیں) ان اایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن میں مسئلہ روح کا ذکر واضح طور پر آیا ہے، نیز قرآن کی نظر میں موت کے معنی فوت ہونا نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان کی شخصیت جسم و جسمانی ترکیب سے عبارت نہیں ہے، ورنہ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جسم کے اعتبار سے موت فوت ہونے، نابود ہونے اور ہاتھ سے نکل جانے سے ہی عبارت ہے۔ لیکن

قرآن ارشاد فرما رہا ہے کہ موت شخصیت انسان کے بطور کامل، یعنی اس کا ذرہ برابر کوئی حصہ چھوڑے بغیر تحویل میں لے لینے کے برابر ہے۔

ایک شخص نے امیرالمومنین علی کی خدمت میں آکر عرض کیا: ''یاامیرالمومنین! مجھے قرآن مجید کی بعض آیات میں تناقض نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں مضطرب و پریشان ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہی بات کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے جن میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔''

فرمایا: ''کونسی ایسی بات ہے مجھے بتا تاکہ اس کا جواب دوں۔'' (بظاہر حضرت علی نے پہلے سوال کرنے کے لیے اس کی بہت ہمت بندھائی) اس نے عرض کیا: ''موت اور قبض روح کا مسئلہ لے لیجیے۔ ایک آیت میں فرماتا ہے: اَللہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا یعنی اللہ نفوس و ارواح کو قبض کرلیتا ہے۔ اس مقام پر قرآن کریم نے قبض روح کو اللہ سے منسوب کیا ہے کہ ارواح کو اللہ خود قبض فرماتا ہے۔ دوسری آیت میں فر ماتا ہے قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ رسول! کہہ دیجیے کہ ملک الموت تمہاری روح قبض کرتا ہے۔ وہ فرشتہ قبض روح کرتا ہے جس کو قبض روح کرنے اور لوگوں کی جانیں نکالنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اسی طرح اور آیات بھی ہیں جو ان دونوں آیات سے میل نہیں کھاتیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یا یہی زیر بحث آیت جس میں ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا۠ الْمَلٰٓىِٕكَةُ .... (جب فرشتے ان لوگں کو جو کافر ہوگئے ہیں پورا پورا لے لیتے ہیں) ان آیات میں کہا جارہا ہے کہ فرشتے آکر روح قبض کرتے ہیں پس ان آیات میں زیادہ فرشتوں کا تذکرہ ہوا ہے ایک کا نہیں۔ پس ایک مقام پر ارشاد ہورہا ہے کہ اللہ خود قبض روح کرتا ہے دوسرے مقام پر یہ ہے کہ ملک الموت روح قبض کرتا ہے، (قرآن مجید میں عزرائیل کا نام نہیں آیا لیکن روایات اسلامی میں آیا ہے کہ ایک مقرب فرشتہ ہے جس کو ملک الموت کہتے ہیں مترجم) جبکہ ایک اور مقام پر اس کام کو فرشتوں کی ایک جماعت سے منسوب کیا گیا ہے۔ پس ان میں سے کون روح قبض کرتا ہے، خود اللہ یا ملک الموت یا فرشتوں کی ایک جماعت؟''

امیرالمومنین علی نے فرمایا: ''تو نے غلط سمجھا۔ ان تینوں آیات میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی۔ ملک الموت جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم و ارادہ سے کرتا ہے، وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو عملی جامہ پہناتا ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہے، فرشتے بھی ملک الموت کے ماتحت ارادہ

پروردگار کو پورا کرنے والے ہیں اور ملک الموت اللہ تعالیٰ کے حکم کو ان کے ذریعہ عملی جامہ پہناتا ہے۔ اس کی تشبیہ اس طرح بیان کی جاسکتی ہے (اگرچہ یہ تشبیہ ناقص و ضعیف ہی ہے) کہ کسی مملکت کا سربراہ کسی صوبے دار کو کسی کام کا حکم دیتا ہے، وہ اپنے ماتحت کارندوں کے ذریعہ اس حکم کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اس عمل کو صوبیدار سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے، کارندوں سے بھی اور سربراہ مملکت سے بھی جس نے یہ حکم دیا تھا۔ البتہ جیسا کہ میںپہلے کہہ چکا ہوں یہ تشبیہ ضعیف ہے کیونکہ کسی چیز کو اللہ سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں علت و معلول کا نظام حکم فرما ہے۔ ہر فرد اپنے مقام و منصب پر اپنا اپنا کام انجام دیتا ہے اور تمام افراد پروردگار کے حکم و ارادہ کے آلہ کار ہیں'' پس زیربحث آیات سے ہے جن میں قبض روح کو نہ تو اللہ سے منسوب کیا گیا ہے نہ ملک الموت سے، بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت سے منسوب کیا گیا ہے۔ جو ملک الموت کے حکم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

عالم برزخ

تیسرا مطلب جس کا قرآنی آیات سے واضح طور پر استفادہ ہوتا ہے یہ ہے کہ عالم قیامت جس میں انسانوں کے تمام اعمال کا مکمل حساب ہوگا اور اس دنیا کے درمیان ایک اور عالم ہے جس کو اصطلاح میں ''عالم برزخــ'' کہا جاتا ہے۔ برزخ کے معنی واسطہ یا پردہ کے ہیں۔ عالم برزخ اس عالم کو کہا جاتا ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان واقع ہے۔ تاہم اگرچہ عالم برزخ میں انسان کے تمام اعمال کا حساب نہیں ہوا ہوتا بلکہ یہ حساب قیامت کے دن ہی ہوگا، عالم برزخ میں افراد کے حالات مختلف ہیں، بعض کو نعمت ملتی ہے اور بعض کو عذاب اسی لیے فرمایا گیا ہے: القبر اما روضۃ من ریاض الجنۃ او حضرۃ من حضر النیران یعنی قبر انسان کے لیے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اہل سعادت کی سعادت مندی کا آغاز موت یا وفات سے ہی ہوجاتا ہے اور عذاب کے مستحق افراد پر موت سے ہی برزخی عذاب نازل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ یہ آیہ مبارکہ اسی مقصد پر دلالت کررہی ہے۔ قرآن مجید یہ نہیں فرماتا ہے کہ قیامت سے پہلے لوگ، چاہے شقی ہوں یا سعید، آخری فیصلے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے یعنی اس وقت تک سب لوگ منتظر رہیں گے۔ لہٰذا فرماتا ہے کہ اگر آپ دیکھیں اس وقت کو جب فرشتے آکر روح قبض کرتے ہیں، ان کی جان نکالتے اور کافروں کو پورے طور پر اپنی تحویل میں لیتے ہیں، ان کے صرف جسم رہ جاتے ہیں جو گل سڑ جاتے ہیں جن پر بعد میں دوبارہ کھال چڑھائی جاتی

ہے اور فرشتے ان پر (عالم برزخ کا) عذاب نازل کرتے ہیں، جسم اگرچہ نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود ان پر عذاب نازل ہوتا رہتا ہے۔ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْہَہُمْ وَاَدْبَارَہُمْ۰ۚ ان کے چہروں اور پشت پر مارتے جاتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ بھڑکتی ہوئی آگ کا مزاچکھو۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللہَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اس آیہ مجیدہ کے دو حصے ہیں: ایک ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ اور دوسرا وَاَنَّ اللہَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جب دردناک عذابوں کی بات ہوتی ہے تو فوراً انسان کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے عذاب کیوں دیتا ہے؟ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یہ سب کچھ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجے ہیں، یعنی یہ سب نعمات یا عذاب وہ نعمات وعذاب ہیں جو تم نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں ایسی آیات بہت ہیں جو اس بات کو بیان کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیت عمومی نظر آتی ہے، امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں بعض مشیت الٰہی کے تابع نہیں ہیں، بلکہ وہ تو فرماتا ہے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں، لیکن ہر چیز کی نسبت اللہ کی جانب اس چیز کے سبب و علت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ انسان کے کاموں کو بھی اس کے اختیار و ارادہ کے راستے سے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

کیا اسلام دین جبر ہے؟

بعض افراد جو فقط ان آیات کو دیکھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں، خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں، لہٰذا وہ تمام اسباب و مسببات میں انسان کے ارادہ و اختیار کا قائل نہیں ہے۔ خصوصاً یورپ والے جب اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو عموماً اسلام کا تعارف (نعوذباللہ) ایک جبری دین کی حیثیت سے کراتے ہیں یعنی ایسے دین کی حیثیت سے جو انسان کے اختیاروارادہ کا قائل نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ قرآن پر لگائی گئی ایک تہمت ہے۔ میں نے اپنے کتابچہ ’’انسان و سرنوشت‘‘ میں اس مسئلہ پہ کسی قدر بحث کی ہے۔ قرآن ایک طرح سے مشیت الٰہی کی عمومیت اور قضاوقدر کی عمومیت کا قائل ہے اس میں اور انسان کے اختیار وارادہ میں کسی قسم کی منافات نہیں پائی جاتی۔ جن آیات میں انسان کے اختیاروارادہ کے مسئلے کو بہت اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایک آیت یہی ہے اور کچھ آیات اس کے بعد بھی آتی ہیں۔ فرماتا ہے: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یہ نہیں کہتا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے تاکہ ہم یہ کہیں کہ ہم اختیار رکھتے تھے یا

اختیار نہیں رکھتے تھے، بلکہ ارشاد ہوتا ہے: بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ یعنی یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے کسی قسم کے جبر کے بغیر اپنی مرضی و اختیار کے ساتھ انجام دئیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختار اور آزاد پیدا کیا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۰ (کہف:۲۹) جو چاہے یعنی خود اپنے اختیار سے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔ اِنَّا ہَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (دہر:۳) یعنی ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے اب وہ خود ذمہ دار ہے کہ شاکر بنے یا کافر۔

یہاں اسی بات کو ذکر کیا گیا ہے: ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں اور تمہارے اپنے اختیار سے معرض وجود میں آیا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ نے نہیں کیا ہے کہ اسے ظلم کا نام دیا جاسکے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ کام اللہ خود کرے اور اس کا عذاب بندہ پر نازل کرے۔ نہیں ایسا نہیں یہ ظلم ہے۔ وَاَنَّ اللہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ اور یہ جان لو کہ اللہ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

یہاں دو نکات ہیں جنہیں بیان کرنا ضروری ہے, ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ’’عبید‘‘ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو ترحم کا ترجمان ہے، یعنی اللہ اپنے بندہ پر کیسے ظلم کرسکتا ہے! یعنی بندہ، بندہ ہوتے ہوئے ترحم کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بندہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ظلم کرے اور اس کے حق کو (نعوذباللہ) پامال کرے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بندہ حیثیت ہی کیا رکھتا ہے کہ اللہ اس پر ظلم کرے؟ کسی شخص کا دوسرے شخص پر ظلم کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی شخصی حیثیت کا قائل ہے۔ انسان اس سے ہی کینہ رکھتا ہے جس کی شخصیت کا وہ قائل ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی شخص یا کسی چیز کو اہمیت ہی نہ دے تو کبھی بھی اس کے جذبات اس کے خلاف برانگیختہ نہیں ہوتے نہ ہی اس کی نسبت کینہ رکھا جاتا ہے اگر آپ کا پائوں پتھر سے ٹھوکر کھا کر زخمی ہجائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے دل میں اس پتھر کے خلاف عداوت پیدا ہوجائے اور آپ اس سے انتقام لینے پر تل جائیں؟ ہرگز نہیں! اگر کوئی حیوان آپ کو دولتی مار دے تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ آپ کے دل میں اس حیوان کے خلاف عداوت پیدا ہوجائے اور آپ اس سے انتقام لینے کے لیے فرصت کی تاک میں رہیں؟ ہرگز نہیں! یہ اس لیے کہ آپ اس کے لیے کسی شخصیت کے قائل ہی نہیں۔ البتہ کسی قدر اس بات کے پیش نظر کہ وہ جان رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی حد تک شخصیت بھی رکھتا ہے، ممکن ہے کہ آپ اس کو ایک ڈنڈا مار دیں۔ البتہ اگر اس جانور مثلاً گھوڑے کی طرح کوئی انسان ایک ٹھوکر آپ کو ماردے تو اس کی نسبت ایسا کینہ آپ کے دل میں ضرور پیدا ہوجائے گا جس کو فقط اللہ ہی

جانتا ہے۔ آپ تاک میں رہیں گے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس سے انتقام لیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہے اور آپ اس کے لیے شخصیت کے قائل ہیں۔ کیا اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہے؟ اصولاً اللہ کے مقابلہ میں بندے کی حیثیت ہی کیا ہے کم حیثیت ہونے، انتقام لینے (عمل کی پاداش انتقام نہیں ہے) اور نعوذباللہ ظلم و ستم کرنے کے اعتبار سے جو نسبت بندہ و خدا کے درمیان پائی جاتی ہے وہ اس نسبت سے بہت چھوٹی ہے جو انسان اور پتھر کے درمیان پائی جاتی ہے۔ پھر کیا اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرےگا؟

دوسرا نکتہ اس مسئلے سے عبارت ہے جس کو ادبی کتب میں زیربحث لایا جاتا ہے یعنی کہتے ہیں کہ اللہ یہ کیوں فرماتا ہے: اَنَّ اللہَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ظلام صیغہ مبالغہ ہے لہٰذا اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ظلم تو کرتا ہی ہے؟ وہ عموماً یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں ظلام سے مراد ظالم ہے۔ لیکن لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ یعنی وہ ظالم نہیں ہے۔ فعال ''فاعل'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن صحیح جواب وہی ہے جو علامہ طباطبائی اعلی اللہ مقامہ نے تفسیر المیزان میںبیان فرمایا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ظالم ہونا فرض ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اللہ ظالم ہو توپھر وہ ظلام بھی ہے، اگر ظالم نہ ہو تو عادل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ یا عادل ہے یا ظلام۔ یعنی اللہ تعالیٰ عادل ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ خدا ظالم ہے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم و ستم کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ (نعوذباللہ) اگر وہ قانون جو کائنات پر حکم فرما ہے ظلم پر مبنی ہو تو پھر وہ کسی خاص فرد یا خاص کام سے متعلق نہیں ہوگا بلکہ تمام چیزیں اس کی زد میں آئیں گی کیونکہ اللہ کا کام تمام چیزوں پر محیط ہے۔ یا وہ فقط عدالت ہی عدالت ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ عدالت نہ ہو تو پھر ظلم ہی ظلم ہوگا بلکہ نہایت درجہ ظلم۔ پس کائنات کے مجموعہ نظام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ بحث چھیڑی جاسکتی ہے کہ یہ نظام عدالت پر مبنی ہے یا ظلم پر۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ اللہ ظلام ہے یا عادل جبکہ عادل سے مراد یہ ہے کہ وہ عدالت کو پورے طور پر برقرار رکھنے والا ہے۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ۰ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ۰ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللہِ فَاَخَذَہُمُ اللہُ بِذُنُوْبِہِمْ۰ۭ اِنَّ اللہَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اس لحاظ سے ان لوگوں کی حالت اور روش بالکل قوم فرعون کی سی ہے۔ پس اللہ نے جس طرح ان کی ان اعمال کے مطابق پکڑ کی جن کے وہ مرتکب ہوئےتھے اور دنیاوآخرت میں قوم پر عذاب نازل کیا، ان کے ساتھ بھی اسی طرح پیش آئے گا۔ بعد والی آیت ان سب باتوں کی وضاحت کررہی ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ

يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۰۝ وَاَنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہم نے عرض کیا ہے کہ چند آیات میں خاص طور پر انسان کے اختیار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے جو قرآن کا ایک شاہکار ہے۔

قرآن مجید میں ایک جیسی دو آیتیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں ایسی بات پائی جاتی ہے جو دوسری میں نہیں ہے۔ ایک سورہ رعد آیت۱۱ میں ہے: ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۰۝ یعنی اللہ کسی قوم کے ان حالات کو تبدیل نہیں کرتا جن سے وہ قوم دوچار ہوتی ہے جب تک وہ قوم خود اپنے سے متعلق، یعنی اپنی روح، فکر، اخلاق اور اعمال سے متعلق چیزوں کو خود تبدیل نہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں کو عزت عطا فرمائی ہے یا بعض قوموں کی عزت خاک میں ملائی ہے یعنی اگر اس نے پست قوموں کو بلند اور بلند قوموں کو پست کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو بدل ڈالا جن کا تعلق ان کے ساتھ تھا۔ البتہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ۰۝وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ۰۝ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۰۝ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ(اے رسول!) کہہ دو کہ اے میرے اللہ، سلطنت کے مالک جو جس کو چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں سب وبیاں ہیں۔ بے شک تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

اسی طرح ہم دعائے افتتاح میں پڑھتے ہیں: الحمدللہ الذی یومن الخایفین وینجی الصالحین و یرفع المستضعفین ویضع المستکبرین ویھلک ملوکا ویستخلف آخرین والحمدللہ قاصم الجبارین مبیرا لظالمین مدرک الھاربین (تعریف کے قابل ہے وہ اللہ جو ڈرنے والوں کو امان اور صالحین کو نجات دیتا عطا فرماتا ہے، کمزوروں کو بلند مرتبہ عطا فرماتا ہے اور متکبرین کو رسوا کرتا ہے، بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے اور دوسروں کو ان کی جگہ پر بٹھاتا ہے، تعریف کے قابل ہے وہ اللہ جو جباروں کی کمر توڑتا اور ظالموں کو نیست و نابود فرماتا ہےاور اپنی بارگاہ سے بھاگنے والوں کو پکڑنےو الا ہے)۔

تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں جس کو عزت ملتی ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے، جس کو ذلت ملتی ہے اللہ ہی دیتا ہے، جسے چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ

نہ سمجھیں کہ اللہ کا کام اس آدمی کی مانند بیہودہ و بے بنیاد ہوتا ہے جو بیٹھ کر قرعہ ڈالتا رہتا ہے کہ ایک شخص سے چھین کر دوسرے کو دے دے یا ایک سے لے کر دوسرے کو دے دے جس میں کوئی حکمت یا قانون نہ ہو۔ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اصول و ضابطے کے تحت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کا ہر کام ضابطہ کے تحت ہے۔ اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہورہا ہے کہ عزت وذلت فقط اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پس اس آیت میں ارشاد ہورہا ہے کہ یہ جان لو کہ ہم کسی اصول و ضابطے کے تحت ہی عزت و ذلت دیتے ہیں۔ ہم لوگوں کےروحانی، معنوی، اخلاقی اور معاشرتی حالات و کیفیات کو دیکھتے ہیں اور ہر اس چیز کو دیکھتے ہیں جو لوگوں کے اختیار واعمال کے دائرہ میں ہو۔ جب تک وہ اچھے ہوں ہم ان کو عزت دیتے ہیں، جب وہ اپنی حالت بدل لیں تو پھر ہم بھی اس کو بدل دیتے ہیں جو ان کو دیا ہوتا ہے۔ عزت اور ذلت ہمارے اختیار میں ہے۔ لیکن ہم اس اصول کے تحت دیتے ہیں اگر بغیر ضابطہ کے ہو تو اللہ حکیم نہیں ہوگا، ضابطہ کے تحت ہی سب کچھ ہے، یعنی سب کچھ منظم و قطعی و قائع کے تابع ہے۔ اِنَّ اللہَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰ۭ اللہ اس وقت تک لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جب تک لوگ (یہ يُغَيِّرُوْا لوگوں کے اختیار کی نشاندہی کرتا ہے) خود اپنے ہاتھوں اپنی حالت نہ بدلیں۔

یہ آیت عام ہے۔ اس بات کو بھی شامل ہے کہ کوئی قوم نعمت و عزت سے محروم ہوکر عذاب و ذلت سے دوچار ہوجائے یا اس کے برعکس عذاب و ذلت سے نجات پاکر نعمت و عزت حاصل کرلے۔ یعنی یہ آیت اس مقام کو بھی واضح کرتی ہے کہ کچھ لوگ اچھے و صالح ہوں اور اللہ کی نعمتیں ان کے شامل حال ہوچکی ہوں۔ بعد میں وہ لوگ برائیوں میں پڑجائیں اور اللہ ان سے اپنی نعمتیں واپس لے لے، اس قوم کو بھی شامل کرتی ہے جو بگڑی ہوئی ہو مگر بعد میں اپنی حالت سنوارلے، توبہ و استغفار کرے، راہ راست پر آجائے، اور اللہ ان کوعزت عطافرمائے۔

زیربحث آیت ان دو میں سے فقط ایک حصہ پر مشتمل ہے، وہ یہ کہ کوئی قوم عزت و نعمت سے ہمکنار ہو، پھر برائیوں میں مبتلا ہوجائے، اللہ تعالیٰ ان سے عزت و نعمت سلب کرلے اور اس کی جگہ انہیں عذاب و ذلت سے دوچار کردے۔ آیہ مجیدہ یہ ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰ۙ ایسا نہیں ہوا ہے کہ اللہ نے کسی قوم کو کوئی نعمت عطا کرکے بلاوجہ ان سے چھین لی ہو مگر یہ کہ انہوں نے اپنی حالت بدل ڈالی ہو۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ پہلی آیت عام ہے، یہ آیت خاص ہے، اس آیت کے نصف مفہوم کو بیان کررہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ایک نکتہ ہے جو اس آیت میں نہیں

ہے۔ اگر قرآن آیات کو دہراتا ہے تو ہر جگہ مقررہ اصول کے تحت ایسا کرتا ہے۔ اس مقام پر فقط یہی کہتا ہے: اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۰ؕ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدلے۔ بلاتشبیہ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کی دوکان پر آکر آپ سے کہے کہ اس تحریر پر دستخط کردیجیے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں دستخط نہیں کروں گا جب تک فلاں شرط پوری نہ ہو۔ لہٰذا آپ نے اس سے زیادہ تو نہیں کہا کہ میں دستخط نہیں کروں گا۔

ایک مقام پر لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا کے الفاظ آئے ہیں۔ قرآن جب سنت الٰہیہ کو بیان کرنا چاہتا ہے، اللہ بتانا چاہتا ہے کہ ہماری خدائی کا تقاضا یہ ہے، اس کے علاوہ محال ہے، یہ امرقطعی، ضروری اور لایتخلف ہے، تو ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے: وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِیُہْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَہْلُہَا مُصْلِحُوْنَ (ھود:۱۱۷) اور تیرا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر ڈالے، حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔ نہ پہلے کبھی ایسا تھا اور نہ اب ایسا ہے کہ تمہارا پروردگار لوگوں پر صرف اس وجہ سے ظلم کرے کہ وہ اللہ کے منکر ہیں، حالانکہ انہوں نے عدالت کے حوالہ سے اپنی حالت سنوار رکھی ہو۔ یا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل:۱۵) اور جب تک ہم رسول مبعث نہ کریں ہم عذاب کرنے والے نہیں ہوا کرتے۔ علمائے اصول کہتے ہیں کہ اس آیت میں ’’قبح عقاب بلابیان‘‘ کا قاعدہ بیان ہوا ہے۔ ہم نہ پہلے کبھی ایسے تھے اور نہ اب ایسے ہیں کہ ان لوگوں پر عذاب نازل کریں جن پر اتمام حجت نہ کی ہو، یعنی ہماری خدائی اس کا تقاضا نہیں کرتی، بلکہ یہ بات ہماری خدائی سے متصادم ہے کہ ہم ان لوگوں پر عذاب نازل کریں جن پر اتمام حجت نہ ہوچکی ہو، اس آیت میں اسی قدر کہا تھا کہ اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ لیکن اس مقام پر فرما رہا ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نہ پہلے کبھی ایسا تھا اور نہ اب ایسا ہے۔ (جن امور کو اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے ان کے بارے میں مسئلہ زبان زیر بحث نہیں آتا ہے) اصولاً اللہ کی یہ شان ہی نہیں۔ اللہ کی ربوبیت اس بات کا تقاضا نہیں کرتی ہے کہ وہ کوئی نعمت کسی قوم سے چھین لے اس سے قبل کہ اس قوم نے خود اپنی حالت نہ بدل لی ہو۔

ان آیات میں غوروفکر کریں اور دیکھیں کیا دنیا میں کوئی ایسی کتاب مل سکتی ہے جو قرآن کی مانند کائنات کے حقائق پر استوار ہو؟ افسوس کہ ہم مسلمان قرآنی تعلیمات کے برعکس سوچتے ہیں؟ ہم خیال کرتے ہیں کہ اللہ کے کام اور اس کی بنائی ہوئی کائنات کے تمام امور ہمارے اوہام و خودساختہ تخیل پر مبنی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہو

بہرحال ہم کم از کم مسلمان کے لفظ سے تو منسوب ہیں۔ ہم شیعہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی رعایا میں اپنے نام درج رکھتے ہیں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ تمام مسئلہ نام اور نام کے اندراج کا ہے۔ اگر کوئی نام کے اعتبار سے بھی مسلمان ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس پر خاص عنایت فرماتا ہے، حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کا قانون و سنت یہ ہے کہ برائیوں میں مبتلا لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی نعمات، عنایات اور رحمتوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ناممکن ہے کہ کوئی قوم خود اپنی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے فیضیاب نہ کرے، یہ رحمت دنیوی ہو یا اخروی كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل:۲۰) یعنی ہم طالبان دنیا وآخرت دونوں جماعتوں کو اپنی عنایات سے نوازیں گے۔ بعض لوگ کم از کم اتنے صالح ضرور ہیں کہ خداوندتعالیٰ ان کو دنیا میں عزت عطا کرے، ہر چند کہ آخرت میں ان پر عذاب ہی نازل کیا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس بات کو صدیوں سے فراموش کیے بیٹھے ہیں کہ قرآن حقائق پر استوار ہے، خیالات، اوہام اورظاہری انتسابوں پر نہیں۔ قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے یعنی حقیقی مسلمانوں کی تعریف یہ ہے: اسلم وجھہ اللہ اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کریں اسلامی اخلاق کے حامل اور اسلامی طریق کار پر کاربند ہوں، ان کا پورا معاشرہ اسلام ہو، صرف ظاہری طور پر شعار اسلام کا مظاہرہ نہ کرتے ہوں۔ کسی اصول کا اعلان یقیناً اپنا اثر رکھتا ہے لیکن یہ اثر واقع مسلمان ہونے سے مختلف ہے۔ علیٰ ہذالقیاس شیعہ ہونا ایک حقیقت ہے، یعنی شیعہ وہ ہے کہ جب کسی سنی سے اس کا موازنہ کیا جائے تو اس کی سوچ اس سنی سے بہتر ہو، اللہ و قیامت کے بارے میں اس شیعہ کا نظریہ سنی نظریے سے بہتروبرتر ہو، اللہ تعالیٰ کی بہتر معرفت رکھتا ہو، اپنے ائمہؑ کی ہدایت کی بدولت اس کے اسلامی و انسانی اخلاق عمومی اخلاق سے بہتر ہوں، اس کے اعمال اس کے مقابل عمومی شخص کے اعمال سے بہتر ہوں، الغرض اس شیعہ کی ہر چیز دوسرے مکتب فکر کے حامل شخص سے بلندوبالا تر ہو، یعنی وہ اسوہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی نظیر ہو۔

ایک شخص امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسکراتے ہوئے عرض کیا: ''یاامیرالمومنین انی احبک'' میں آپؑ سے محبت کرتا ہوں فرمایا ''ولکن ابغضک'' مگر میں تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔ حضرت نے یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ واقعی وہ حضرت کو دوست رکھتا تھا۔ اس نے کہا: ''کیوں؟'' فرمایا: تیرے فلاں کام کی وجہ سے۔ ''فلاں شخص قرآن پڑھنا چاہتا تھا اور تجھ پر اسے قرآن پڑھانا واجب تھا۔ مگر تو نے اس سے اس کے پیسے وصول کیے۔''

لہٰذا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم تو حضرت علی علیہ السلام کو دوست رکھیں لیکن ہمارے اعمال ایسے ہوں کہ آنحضرت ہم کو اپنا دشمن جانیں۔ حضرت امام جعفرصادق فرماتے ہیں: کونوا لنا زینا ولا تکونوا علینا شینا ''تم شیعہ ہم ائمہ کے لیے باعث فخر بنو، ہماری زینت کا باعث بنو، ہمارے لیے شرمندگی، ننگ و عار اور بدنامی کا موجب نہ بنو یعنی دوسرے مسلمانوں کے لیے تقویٰ پاکیزگی و راستبازی کا نمونہ قرار پاؤ۔ ایسے بنو کہ جب لوگ تمہیں دیکھیں تو کہہ اٹھیں ''رحم اللہ جعفرا'' خدا امام جعفرصادق علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائے کہ انہوں نے کتنے اچھے شیعہ بنائے ہیں۔ ''ولا تکونوا علینا شینا'' ہمارے لیے ننگ و عار کا موجب نہ بنو۔ جب تمہارے اخلاق، تمہارا لین دین، تمہارے احساسات، تمہارا کردار اسلام کے خلاف ہوں گے تو تم ہمارے لیے خجالت، شرمندگی اور پریشانی کا موجب ہوگے'' کیا اس سے بہتر بھی کہا جاسکتا ہے؟ وہ قرآن کا فرمان، وہ نبی اکرم کا ارشاد، جس کو میں پہلے آپ کی خدمت میں بیان کرچکا ہوں، نیز یہ امام جعفرصادق کا ارشاد، اس سے بہتر اور کیا کہاجاسکتا ہے؟ مگر کیا ہم اپنی ہٹ دھرمی سے باز آتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ صرف ہم ہی اللہ تعالیٰ کی عنایت کے مستحق ہیں اور ہمارے لیے ائمہ کی نسبت ہی کافی ہے، کسی اور چیز کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نےہم بے عملوں کے لیے ہی بہشت تیار کررکھی ہے۔ پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم مسلمان اس قدر بدنصیب و بے بس کیوں ہیں؟ اس کا جواب قرآن مجید نے دیا ہے۔ جس قوم کے افسر اسرائیل میں تربیت پائیں، پھر یوگنڈا میں جاکر حکومت کا تختہ الٹنے کے محرک ہوں تو کیا ایسی قوم سے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ سعادت سے ہمکنار ہوگی؟ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ ان سب کی جڑیں ہیں۔ ہم مسلمانوں میں فساد ونفاق کی جڑیں پائی جاتی ہیں۔ یہ شاخیں ہیں جو ان جڑوں سے نکلی ہیں نہ معلوم ہم کب بیدار ہوں گے، کب ہوش میں آئیں گے، کب بارگاہ الٰہی میں توبہ کریں گے، کب اپنی اصلاح کریں گے اور معلوم نہیں کہ ہم کب اپنے آپ کو آیات قرآن کے سانچے میں ڈھالیں گے؟ یہی تھوڑی بہت توجہ و احساس جواب پیدا ہوا ہے شاید ہماری اصلاح اور حقیقی مسلمان بننے کا پیش خیمہ ثابت ہو، انشاء اللہ۔

دسویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۰۝۵۳ وَاَنَّ اللہَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۳۝۵

یہ اس لیے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کوعطا کی ہو بدلنے والا نہیں جب تک کہ وہ اپنے نفسوں میں تغیر پیدا نہ کریں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس آیہ شریفہ کے بارے میں گذشتہ ہفتے قدرے بحث کی گئی تھی۔ جس کا تتمہ و تکامل اب عرض کرتا ہوں۔

تمہیداً عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ ’’القرآن یفسر بعضہ بعضا‘‘ قرآن مجید کی بعض آیات بعض دیگر آیات کی تفسیرووضاحت کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک ایسی آیت بھی ہے جو درحقیقت شناخت قرآن کا طریقہ و اسلوب بتارہی ہے۔ یہ آیہ مبارکہ قرآن مجید کے طریق کار کو بیان کررہی ہے۔

سورہ آل عمران کی ساتویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ھُوَالَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْہُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ۰۝۷ (اے رسول۝) وہ وہی (خدا) ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اس کی بعض آیات تو محکم (بہت صریح) ہیں۔ وہی (عمل کرنے کے لیے) اصل اصل (وبنیاد) کتاب ہیں اور کچھ (آیات) متشابہ ہیں (جن کے معنی میں کئی پہلو نکل سکتے ہیں)

یہ آیہ مجیدہ قرآن کریم کی آیات کو محکم و متشابہ میں تقسیم کررہی ہے۔ پھر قرآن کی محکم آیات کو ام الکتاب (کتاب کی اصل) کا نام دے رہی ہے۔ ان کو کتاب کی اصل کے نام سے پکارنے کی غرض یہ ہے کہ یہ آیات دیگر آیات کی وضاحت و تشریح کرتی ہیں۔ متشابہ آیات وہ ہیں جن میں کوئی ایسی حقیقت کلی طور پر بیان کی گئی ہو جس کی وضاحت و تشریح مختلف طرح سے ہوسکتی ہو۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کس طرح ان کی تفسیروتشریح کرتے ہیں۔ ان آیات کی تشریح و تفسیر کے لیے

لازم ہے کہ ان آیتوں کی طرف رجوع کیا جائے جن کو قرآن نے قرآن کی اصل کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ان آیات مجیدہ کی ام الکتاب کی اصطلاح سے تعبیر نہایت خوبصورت تعبیر ہے۔ اب ہم اس مطلب کی مثال اسی زیربحث مسئلہ سے پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف تو اس سے زیربحث مسئلہ کی وضاحت ہوجائے اور دوسری طرف ہم آیت عنوان پر بھی اچھی طرح روشنی ڈال سکیں۔

پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی عمومی مشیت دکھلائی دیتی ہے قرآن حکیم ایک عجیب و غریب کتاب ہے جو اصول توحید کی وضاحت کرتی ہے، یعنی انسان کو ہمشیہ شرک سے دور ہٹاتی ہے اور اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور اس کے علم کے بغیر کائنات میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں من یشاء اور مایشاء (جس طرح اللہ چاہے) کے الفاظ بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے اس کے علاوہ کائنات میں کچھ بھی واقع نہیں ہوتا۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے ہر مسلمان کو اس حقیقت کا معتقد ہونا چاہیے کہ جو بات اللہ تعالیٰ نہ چاہے وہ کائنات میں رونما نہیں ہوتی، یعنی جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہی واقع ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات وضاحت طلب ہے کہ سب کچھ کس طرح اللہ تعالیٰ کی مشیت سے واقع ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں ہمارا تصور جبر کے قائلین یا علم کلام کی اصطلاح میں ''اشاعرہ'' جو اہل سنت کا ایک فرقہ تھا، سے کسی قدر مماثلت رکھتا ہو۔ یہ لوگ دنیا میں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کی علت نہیں جانتے تھے۔ یہ حضرات اس بات سے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتی ہے، یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ کائنات میں کوئی چیز بھی کسی اور چیز کی علت نہیں۔ اگر ہم قرآن میں موجود اس بات سے کہ تمام امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں، حقیقتاً یہ نتیجہ نکالنے لگیں کہ کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کی علت نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی قوم دنیا میں سعادت مند ہوتی ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بلکہ اس کے سلسلہ میں اللہ کی مرضی ہی یہ تھی۔ اسی طرح اگر کوئی قوم دنیا میں بدبختی کی حامل ہو تو پھر بھی اس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی قرار دینا ہوگا۔ پس آخرت میں اگر بعض لوگ جنتی قرار پائیں تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جنت میں کیوں گئے کیونکہ مشیت الٰہی تھی کہ یہ جنت میں جائیں۔ چنانچہ جب ہم تسلیم کرلیں کہ ہر چیز مشیت الٰہی کے تابع ہے تو پھر اس سلسلہ میں کوئی سوال اٹھایا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر ہم کہیں کہ نیک لوگ اعمال صالح انجام دینے کی وجہ سے جنت میں گئے تو وہ کہیں گے کہ یہ ان کی جنت میں جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ ہر چیز مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ لہٰذا

اس بات میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک صالح ومتقی و فرمانبردار بندہ کو جہنم میں ڈال دے اور معصیت کار، گنہگار، فاسق و فاجرو مشرک کو داخل جنت فرمادے، کیونکہ یہی اس کی مرضی ہے اور اس کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت و سبب نہیں۔ بعض اشخاص تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلیتے ہیں کہ اگر اس کے علاوہ اعتقاد رکھیں، یعنی اگر کہیں کہ کائنات میں ہر چیز کسی دوسری چیز کے لیے علت ہے تو یہ توحید اور مشیت الٰہی کو تسلیم کرنے کے منافی ہوگا۔

ایک اور جماعت نے محسوس کیا کہ یہ بات تو بالکل ہی غلط ہے یعنی کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کا سبب نہیں! یہ بات نہ تو دنیوی نظام سے میل کھاتی ہے اور نہ ہی آخرت کے نظام سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر دنیا میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہ ہو تو پھر ایسا ہونا چاہیے کہ مثلاً کسی سال بارش نہ ہو، برفباری نہ ہو، موسمی حالات موافق نہ ہوں اور اس سال لوگ زمین کاشت کرکے بہت زیادہ غلہ حاصل کرلیں، یا بالکل کاشت ہی نہ کریں اور بہت زیادہ غلہ حاصل کریں۔ پھر کسی دوسرے سال محنت کریں، زمینوں میں ہل چلائیں، پانی دیں، کھادیں وغیرہ ڈالیں، موسم بھی موافق ہو، صحیح وقت پر بارش اور برفباری ہو، کوئی آفت بھی نہ آئے لیکن اس سال پیداوار بالکل ہی نہ ہو کیونکہ کوئی بھی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں ہے۔ اسی طرح مثلاً یہ ممکن ہو کہ کوئی شخص شادی نہ کرے مگر صاحب اولاد ہوجائے اور تندرست و بے عیب عورت و مرد آپس میں شادی کریں مگر وہ صاحب اولاد نہ ہوپائیں۔ کیونکہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت ہوتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ جان لیں کہ عالم آخرت بھی ایسا ہی ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ دنیا میں بھی تمام کام اصول علت و معلول کے مطابق واقع ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

بعدازاں اس جماعت نے کسی قدر مختلف فکر اختیار کرلی یعنی کہنے لگے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں اس سے تمام کی تمام چیزیں مقصود نہیں بلکہ بعض امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں اور بعض مشیت الٰہی کے تابع نہیں ہیں۔ یعنی بعض امور مشیت الٰہی کے بغیر واقع ہوجاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم قرآن مجید کی منطق کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا قائل بھی ہونا پڑے گا کہ تمام چیزیں

مشیت الٰہی کے تابع ہیں اور اس بات کا بھی معتقد ہونا چاہیے کہ دنیاوآخرت اور کائنات کا کام بے بنیاد نہیں ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت ہی نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کے خاص علل و اسباب ہوتے ہیں، وہ اپنے علل و اسباب کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ جن کے بغیر اس کا معرض وجود میں آنا محال ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ایک نظام و ضابطہ ہے، یعنی کائنات میں جو نظام و ضابطے پائے جاتے ہیں یہ مشیت الٰہی سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ تمام چیزیں ہر طرح مشیت الٰہی ہی کے تابع ہیں۔ لیکن مشیت الٰہی یہ ہے کہ ہر چیز کے خاص اسباب ہوں، ایک نظام متعین ہو، ہر منزل تک پہنچنے کا ایک راستہ موجود ہو جسے طے کیے بغیر انسان کا اس منزل تک پہنچنا محال ہو۔ ''امر بین الامرین'' کے یہی معنی ہیں۔

''کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں ہے'' نظریہ جبر ہے اسی طرح یہ کہ ''بعض چیزیں تو اللہ کی مشیت کے تابع ہیں اور بعض اللہ کی مشیت کے تابع نہیں ہیں'' نظریہ ''تفویض'' کہلاتا ہے، یعنی بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ بعض چیزوں کا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں، جو ہوتا ہے ہوتا رہے یہی عقیدہ تفویض ہے۔ لہٰذا جو نظریہ تسلیم کرتا ہے کہ تمام کام مشیت الٰہی کے تابع ہیں، نیز یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز کے خاص اسباب ہیں، یہ ہی ''امربین الامرین'' کا نظریہ ہے۔

میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ قرآن کی بعض آیات بعض دیگر آیات کی تفسیر کرتی ہیں اور قرآن کے اپنے بقول بعض آیات ''ام الکتاب'' یعنی آیات کی اصل ہیں جو محکمات کہلاتی ہیں۔ پس وہ آیات جو متشابہ ہیں، یعنی جن کی کئی طرح سے تفسیر کی جاسکتی ہے، ان کی وضاحت و تشریح کے یلے ان آیات کی مدد لینی چاہیے جن کی تفسیر ایک سے زیادہ طور پر نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً ایک طرف قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے قُلِ اللّٰہُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ کہیے اے پروردگار تمام سلطنتوں کا فرمانروا اور تمام طاقتوں کا مالک تو ہی ہے تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ تو جسے چاہتا ہے سلطنت و قدرت عطا فرماتا ہے اور جس سے چھیننا چاہے چھین لیتا ہے۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ۰ۭ (آل عمران:۲۶) تو جسے چاہے عزت سے نوازتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے یہ آیت متشابہ ہے یعنی کئی طرح سے اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے فقط یہی ایک آیت ہوتی تو اس بات کا امکان پایا جاتا کہ ہم بھی اس کی وہی تفسیر بیان کریں اور اسی طرح تشریح کریں جو

''جبر'' کے قائلین نے کی ہے۔ یعنی قرآن فرماتا ہے کہ تو جسے چاہے فرمانروائی عطا کرے، جس سے چاہے چھین لے، تو جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت چھین لیتا ہے۔ ''جبر'' کے قائلین بھی یہی کہتے ہیں، البتہ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں۔ دوسرے عقیدہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں یعنی یہ قاعدہ کلیہ تمام افراد پر منطبق نہیں۔ یعنی بعض امور ایسے بھی ہیں جن کا مشیت الٰہی سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا عام کلیہ ہے جس کے حکم سے بعض چیزوں کو علیحدہ کیا جاسکتا ہے، یعنی بعض باتیں قابل استثنا ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے ایسے کلیات ہے جو قابل استثنا ہیں۔

لیکن اگر ہم زیربحث آیت کو اس آیت کےلیے آیہ محکم قرار دیں یعنی اس آیت کی اصل قرار دیں اور اس کی مدد سے اس آیہ مجیدہ کی تفسیر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں صحیح ومکمل ہیں اور کوئی اعتراض ان پر نہیں ہوسکتا۔ زیربحث آیت کہتی ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰ۙ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہرگز ایسا نہیں، یعنی اس کی خدائی اس بات کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ یہ اس کی خدائی کے اصول کے خلاف ہے کہ وہ کسی قوم سے بلاوجہ نعمت چھین لے، مگر یہ کہ اس قوم نے پہلے سے خود ہی اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرلی ہو۔ لیکن دوسری آیت میں ایک عمومی پہلو بیان فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰ۭ (رعد:۱۱) جب تک لوگ خود آپ اپنی نفسی حالت میں تغیر نہ ڈالیں، اللہ ہرگز تغیر نہیں ڈالا کرتا۔ آیت میں نعمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ نعمت وعذاب دونوں پر مشتمل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم سے کوئی نعمت سلب نہیں فرماتا نہ ان پر عذاب نازل کرتا ہے مگر یہ کہ انہوں نے اپنی پہلی حالت میںخود ہی تبدیلی پیدا کی ہو۔ نیز وہ کسی قوم کو عذاب سے نجات دے کر ان کو نعمت سے نہیں نوازتا جب تک کہ انہوں نے اپنی پہلی حالت بدل نہ لی ہو۔ اس نعمت اور عذاب سے مراد عزت و دولت ہی ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے: تُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ۝۰ۭ یعنی تو جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کردیتا ہے۔ یہ دونوں آیات عزت و ذلت کے قانون کو بیان کررہی ہیں یقیناً عزت اللہ ہی عطا فرماتا ہے، اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جو عزت دے سکتی ہو۔ علی ہذا القیاس ذلت بھی خدا ہی کی طرف سے ہے اس کے علاوہ کوئی قدرت ذلیل نہیں کرسکتی۔ پس تمام طاقتوں کا سرچشمہ صرف ذات پروردگار ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ لیکن اس بات پر یقین کامل لازم ہے کہ اللہ کا کام بیکار وغیرضروری نہیں ہوتا لہٰذا اس اصول کی بنیاد پر ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز کسی

دوسری چیز کی علت نہ ہو اور اللہ بلاوجہ کسی قوم کو عزت یا ذلت دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ کے کام ان لوگوں کی مانند ہرگز نہیں ہوتے جو آنکھیں بند کرلیتے ہیں اور قرعہ اندازی کرتے ہیں ذٰلِكَ بِاَنَّ اللہَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَہَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰۝۝ (انفال:۵۳) یا وہ دوسری آیت جو سرہ رعد کی گیارہویں آیت ہے: اِنَّ اللہَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۝۰۝۝ یعنی اس بات کو جان لینا چاہیے کہ ذلت سے نکال کر عزت دینا یا اس کی بجائے عزت چھین کر ذلت دینا، یہ سب مشیت الٰہی کے تابع ہے، مگر اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک ضابطہ واصول ہے جو یہ ہے کہ جب تک کوئی نیک و صالح قوم خود اپنی مرضی سے فسادوبدی کی جانب مائل نہ ہو اللہ اسے اپنی عنایات سے محروم نہیں فرماتا۔ اسی طرحجب تک کوئی بگڑی ہوئی قوم اللہ کے احکام کی بجاآوری کی طرف رجوع نہیں کرتی اللہ تعالیٰ ان کی جانب اپنی نظررحمت نہیں کرتا۔

اس سلسلے میں نہج البلاغہ میں خاص طور پر زیادہ مطالب بیان ہوئے ہیں۔ ایک خطبہ میں، جس کا نام خطبہ قاصعہ ہے، حضرت امیرالمومنین نے قرآن کے اسی مسئلہ یعنی قوموں کی عزت و ذلت پر تفصیلی بحث فرمائی ہے یعنی امیرالمومنین حضرت علی قرآن کی اسی آیت کی وضاحت فرماتے ہیں، اب میں بطور مثال دو احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ حدیثیں اسی آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

پہلی حدیث کافی میںہے۔ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے مروی ہے: ان اللہ بعث نبیا من انبیائہ الی قومہ واوحی الیہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی پر جس کو اس کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا تھا، وحی نازل فرمائی: ان قل لقومک اپنی قوم کو مطلع کرو کہ انہ لیس من اہل قریۃ ولاناس (قریہ لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ دیہات ہی ہو۔ ہم اس زمانہ میں دیہات کو قریہ کہتے ہیں لیکن قرآن شہر کے لیے بھی قریہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یہ ’’قری‘‘ کے مادہ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کے جمع ہونے کا مقام) کسی محلہ، دیہات یا شہر کےلوگ، الغرض یہ سب لوگ ایسے نہیں کہ کانوا علی طاعتی سب میری راہ پر گامزن اور میرے مطیع ہوں، یعنی صالح ہوں۔ فاصابھم فیھا سراء اسی وجہ سے انہیں خوشی، نعمت و سعادت حاصل ہو فتحولوا عما احب الی ما اکرہ اور بعد میں وہ ان نعمتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں یعنی ان نعمات کو عیش وفسادوبداخلاقی کا موجب بنا کر بگڑ جائیں، (بالفاظ دیگر ایسے لوگ نہ ہوں کہ صالح ہونے اور نیکوکاری کی بنا پر میں انہیں سعادت مند بنائوں مگر بعد میں یہ سعادت اور خوشی ان کو برائی کی راہ پر ڈال دے یعنی وہ اس نعمت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں) الا تحولت

لهم عما یحبون الی مایکرھون پھر میں بھی ان کے ساتھ دوسرے طریقہ سے پیش آئوں، جس چیز کو وہ پسند کرتے ہیں ان سے لے لوں اور ان کو وہ دے دوں جس سے ان کو نفرت ہو۔ یعنی نعمت کی بجائے ان پر عذاب نازل کروں۔ وانہ لیس من اھل قریۃ ولا اھل بیت کانوا علی معصیتی اور کسی جگہ کے، حتیٰ کہ کسی گھر کے لوگ ایسے نہیں کہ وہ میری نافرمانی کریں اور برائی کی راہوں پر گامزن ہوں فاصابھم فیھا ضراء جس کے نتیجے میں ان پر تنگی آجائے فتحولوا عما اکرہ الی ما احب اور جسے میں ناپسند کرتا ہوں اس کو چھوڑ دیں اور جسے میں پسند کرتا ہوں اس کی طرف لوٹ آئیں الا تحولت عما یکرھون الی مایحبون مگر یہ کہ میں بھی دوبارہ ان کے بارے میں اپنی رائے بدل دوں اور ان کی تنگی کو خوشحالی میں تبدیل کردوں تاکہ وہ راضی ہوں اور اسے دوست رکھیں۔

دوسری حدیث کو یہاں (تفسیرالمیزان ج۹ ص۱۱۰) تفسیر صافی کے حوالے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ بھی کافی ہی کی حدیث ہے۔ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں: کان ابی یقول میرے والد مترم امام محمدباقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ ان اللہ عزوجل قضی قضاء حتما اللہ تعالیٰ نے حتمی اور قطعی فیصلہ کردیا ہے کہ لا ینعم علی العبد بنعمۃ فیسلبھا ایاہ حتی یحدث العبد ذنبا یستحق بذلک النعمۃ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی نعمت اس لیے عطا نہیں فرماتا کہ پھر اس سے چھین لے، مگر یہ کہ بندہ خود پہلے کسی گناہ کا مرتکب ہوچکا ہو، یعنی اس بندے نے نعمت سلب ہونے سے پہلے اپنے اندر خود منفی تبدیلی پیدا کرلی ہو۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو کسی نعمت سے نوازے اور انسان گناہ کا مرتکب ہوجائے، وہ گناہ خواہ کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ اس نعمت کو انسان سے چھین لیتا ہے، یا گناہوں اور چھینی جانے والی نعمتوں میں خاص تعلق پایا جاتا ہے، یعنی ہر گناہ کسی خاص نعمت کے چھن جانے کا موجب بنتا ہے، کسی دوسری نعمت کے چھینے جانے کا نہیں، جیسا کہ ہر اطاعت کسی خاص نعمت کے حصول کا باعث بنتی ہے، تمام نعمتوں کے حصول کا نہیں۔ مثلاً ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ ہمیں حقوق اللہ کو ادا کرنا چاہیے اور حقوق العباد کو بھی۔ حقوق اللہ سے مراد وہ فرائض ہیں جن کا تعلق ہماری ذات اور اللہ کے ساتھ ہے مثلاً نمازوروزہ وغیرہ۔ حقوق العباد سے مراد عدالت و انصاف وغیرہ یعنی لوگوں کے وہ حقوق جو براہ راست ہمارے ذمہ ہیں۔ یہ لوگوں کے حقوق کی صورت میں ہماری ذمہ داریاں ہیں، یعنی دوسروں کے حقوق جو ہمارے ذمہ ہیں۔ بعض اوقات ہمارا گناہ یہ

ہوتا ہے کہ ہم نے حقوق اللہ کو ادا نہیں کیا ہوتا اور بعض اوقات ہمارا گناہ حقوق العباد کی عدم ادائیگی سے عبارت ہوتا ہے۔ حقوق اللہ مختلف ہیں، مثلاً! کبھی ہم نماز نہیں پڑھتے ہیں، یا روزہ نہیں رکھتے ہیں، یا نعوذباللہ شراب پیتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں، یا حج کے لیے نہیں جاتے۔ اسی طرح حقوق العباد ہیں۔ کیا ان میں فرق نہیں ہے؟ انسان جونہی گناہ کرے اللہ کوئی نعمت اس سے چھین لیتا ہے یا ہر گناہ کسی خاص نعمت سے مرتبط ہوتا ہے۔ دوسری بات درست ہے۔ اب میں آپ کی خدمت میں ایک دلیل پیش کرتا ہوں، جن کو دعائے کمیل پڑھنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے وہ جمعرات کی شب میں اس کو پڑھتے ہیں۔ اس میں آتا ہے: اللهم اغفرلی الذنوب التی تنزل النقم۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تغیر النعم۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تنزل البلاء۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تحبس الدعا (اس دعا میں گناہوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے) اے پروردگار! میرے وہ گناہ معاف کردے جو نزول عذاب کا سبب بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کردے جو نعمتوں کے چھن جانے کا موجب بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کردے جو نزول بلا کا باعث بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کرما دے جو ہماری دعائوں کو (محل استجابت سے) روک لیتے ہیں (یعنی یا تو ہم سے دعا کی توفیق چھین لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم دعا کرتے ہی نہیں اور یہ اس کی بدترین صورت ہے یا ہم دعا کریں تو وہ قبول نہ ہو) اس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں کی ہر قسم اپنا خاص اثر رکھتی ہے۔

گذشتہ ہفتے ہم نے جس آیہ مبارکہ کی تلاوت کی تھی وہ عجیب و غریب آیت ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُہْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَہْلُہَا مُصْلِحُوْنَ (هود:۱۱۷) تمہارا پروردگار ہرگز ایسا نہیں کہ کسی قوم کو ظلم کے باعث ہلاک کرے حالانکہ وہ قوم اصلاح شدہ یا اصلاح کرنے والی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قوم ظالم بھی ہے اور اصلاح کرنے والی بھی۔ یہاں ظلم سے مراد ظلم عظیم یعنی شرک ہے جبکہ مصلح سےمراد آپس میں اصلاح کرنے والے ہیں۔ پس وہ حقوق اللہ کے اعتبار سے ظالم اور حقوق العباد کے اعتبار سے اصلاح کرنے والے ہیں۔ اس بنا پر قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر دنیا میں کسی قوم کے افراد آپس میں اچھے مگر کافر و مشرک ہوں، بالفاظ دیگر ان میں عدالت برقرار ہو لیکن وہ مشرک ہوں، تو اس دنیا میں اللہ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبراکرم نے فرمایا: الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم عجیب جملہ ہے۔ ایک بادشاہی، حکومت، نظام کفر کے باوجود برقرار رہ سکتا ہے، لیکن ظلم کے ساتھ نہیں۔ کفر بھی گناہ ہے اور ظلم بھی۔ لیکن ہر گناہ میں تاثیر کا ایک پہلو ہے۔ زندگی کے نظام کو نیست و نابود کرنے میں کفر اس قدر تاثیر نہیں رکھتا جس قدر ظلم رکھتا ہے۔ پس

اگر دو طرح کے لوگ ہوں جن میں ایک جماعت مسلمانوں کی ہو جو آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہوں اور دوسری جماعت کافروں کی ہو لیکن وہ آپس میں عدالت و انصاف سے کام لیتے ہوں، تو آخرت کے اعتبار سے یقیناً مسلمان بہتر ہیں...

افسوس کہ فنی خرابی کی وجہ سے تقریر کا کچھ حصہ محفوظ نہیں ہوسکا۔

گیارھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللہِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَہُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۵۵ۖۚ اَلَّذِيْنَ عٰہَدْتَّ مِنْہُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَہْدَہُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّۃٍ وَّہُمْ لَا يَتَّقُوْنَ۵۶ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّہُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِہِمْ مَّنْ خَلْفَہُمْ لَعَلَّہُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۵۷ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَيْہِمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ۰ۭ اِنَّ اللہَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ۵۸ۧ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا۰ۭ اِنَّہُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ۵۹

اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں (باوجود اس کے) پھر ایمان نہیں لاتے۔ (اے رسولﷺ) جن لوگوں سے تم نے عہدوپیمان لیا تھا پھر وہ لوگ اپنے عہد کو ہر بار توڑ ڈالتے ہیں اور پھر (خدا سے) نہیں ڈرتے تو اگر وہ لڑائی میں تمہارے قابو میں آجائیں تو (ایسی گوشمالی کرو) ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی تتربتر کردو جو ان کی پشت پر ہوں تاکہ یہ عبرت حاصل کریں۔ اور اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت (عہدشکنی) کا خوف ہو تو تم بھی برابر ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو (عہدشکنی کے ساتھ عہدشکنی کرو)۔ اللہ ہرگز دغابازوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اور کفار یہ خیال نہ کریں کہ وہ (مسلمانوں سے) آگے بڑھ نکلے(کیونکہ) وہ ہرگز (مسلمانوں کو) عاجز نہیں کرسکتے۔

ان چند آیات میں پہلی دو آیتوں کی تفسیر ہم گذشتہ ہفتہ بیان کرچکے ہیں۔ پہلی آیت اس بارے میں تھی کہ چلنے والوں میں سے بدترین مخلوق کون ہیں؟ فرمایا گیا وہ انسانوں ہی کی ایک قسم ہے اس مقام پر قرآن مجید بعد میں بیان کیے جانے والے ایک مطلب کی مناسبت سے انسان کی ایک غیرانسانی صفت کو بیان کررہا ہے جس کا تعلق وعدہ خلافی یا نقص عہد سے ہے۔ گویا قرآن حکیم فرما رہا ہے کہ ہم نے انسان کی اپنی امتیازی خصوصیات کے پیش نظر تمام جانوروں اور حرکت کرنے والوں میں اسے پست ترین قرار دیا ہے۔ ان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جب دوسروں سے کوئی معاہدہ کرتے ہیں(معاہدہ کرنا اصطلاحی طور پر قول شرافت ہے یعنی یہ انسانی شرافت کو گروی رکھنے کا نام ہے) لیکن ان کا معاہدہ مکاری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اسے توڑ دیا جاتا ہے۔ صرف ایک مرتبہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی بلکہ انسان ہر

معاہدے کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے۔ ہم دینی امور کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کوئی شخص معصوم نہیں، سب لوگوں سے خطا، غلطی اور گناہ کا سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن کچھ لوگ متقی ہوتے ہیں۔ تاہم بعض اوقات ان سے بھی گناہ سرزد ہوجاتا ہے لیکن گناہ کا ارتکاب ان کے لیے ایک امرغیرعادی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بعد میں گناہ پر نادل ہوجاتے ہیں، اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں اور آئندہ ویسا کام نہ کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ گناہ کی اہمیت نہیں جانتے متواتر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس صفت کو ہم تقویٰ کا نام دیتے ہیں اس سے یہ لوگ بالکل بے بہرہ ہیں۔ قرآن کریم ان پست ترین جانوروں کے بارے میں جو انسانوں ہی کی شکل رکھتے ہیں، یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے ایک مرتبہ وعدہ خلافی کی کیونکہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ایک ہی لغزش تو ان سے سرزد ہوئی ہے بلکہ ان کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ وہ جب بھی عہدوپیمان کرتے ہیں اسے توڑڈالتے ہیں۔ ہم عرض کرچکے ہیں کہ ایفائے وعدہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ ہر انسان کا ضمیر اسے ایفائے وعدہ کا حکم دیتا ہے، وہ شخص خواہ مسلمان ہو یا کافر، بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، مابعد الطبیعات پر بھی ایمان رکھتا ہو یا نہیں۔ یہ بات ان امور میں سے ہے جن کی پابندی کا حکم ہر شخص کا ضمیر اس کو دیتا ہے۔ لہٰذا جو شخص کبھی اپنا وعدہ وفا نہ کرتا ہو اس کا عہدوپیمان مکاری و دھوکہ دہی کے لیے ہو، اسے توڑنے ہی کا ارادہ رکھتا ہو، وہ شخص انسانیت اور اس چیز سے تہی دامن ہے جس کو شرف انسانیت کہا جاتا ہے درحقیقت وہ انسان ہی نہیں۔

شرافت انسانی

عہدحاضر میں ایک مسئلہ بہت زیادہ اٹھایا جاتا ہے خصوصاً حقوق انسانی کے مسائل کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان یہ مسئلہ زیادہ زیربحث آتا ہے۔ اس مسئلہ کو وہ ''شرافت انسانی'' کا نام دیتے ہیں، یا جیسا کہ اقوام متحدہ کے بیان کردہ انسانی حقوق کے مسندیہ میں آیا ہے یہ مسئلہ عبارت ہے ''انسانی حیثیت'' سے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان ایک خاص شرافت و حیثیت کا حامل ہے، اسی شرافت و حیثیت کے باعث انسان اس احترام کا مستحق ہے حیوانات، نباتات اور جمادات جس کے مستحق نہیں ہیں۔ مثلاً اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کا خون محترم ہے جبکہ ہر حیوان کا خون محترم نہیں۔ کہتے ہیں کہ انسانی شرافت الگ چیز ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ آزادی انسان اصولاً لائق احترام ہے جبکہ اس آزادی میں دوسرے جانداروں کو شامل نہیں کرتے۔ بعض انسان مثلاً ہندو ایسے

بھی ہیں جو بعض حیوانات کا خون محترم جانتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیت وہ گائے کو اور اس کے بعد دوسرے حیوانات کو دیتے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ ہندو بھی حشرات الارض یا ایذا دینے والے جانوروں کا خون بہانا مباح جانتے ہیں۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہتے کہ سانپ، بچھو، بھڑ، شہد کی مکھی یا مچھر کا خون بھی محترم ہے۔ وہی ہندو جو مرغ، بکری، گائے اور اونٹ کو مارنے اور ان کا گوشت کھانے سے اجتناب کرتا ہے، کیڑے مکوڑنے مارنے والی دوائیں اپنے کمرے میں چھڑک کر ایک ہی دفعہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مچھروں کو مارڈالنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ دراصل مسئلہ صرف جان سےمارڈالنے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر طرح کی آزادی سے محروم کرنے کا بھی ہے۔ ہاتھی یا گھوڑا ابتدا میں آزاد ہوا کرتا تھا۔ جسے ہم وحشی کہتے تھے۔ یہ جانور پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں آزاد گھومتے تھے۔ کیا یہ جانور اپنی مرضی سے انسان کے پاس چل کر آئے اور ان سے کہا کہ ہمیں سدھائو، سواری کا کام لو، گاڑی میں جوتو، باربرداری کے لیے استعمال کرو۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ انسان ان سے استفادہ کرتے ہیں، اپنے آپ کو ان جانوروں کا مالک جانتے ہیں، کبھی بھی حیوانوں کی آزادی و بڑائی کی بات نہیں کرتے کہ یہ بھی جاندار ہیں، ایک طرح کی ذاتی شرافت کے مالک ہیں، آزاد پیدا ہوئے ہیں اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے کا حق ہے، اور ہمیں چاہیے کہ ان تمام جانوروں کو آزاد کردیں جن سے ہم کام لیتے ہیں اور جن کو ہم نے اپنے مقاصد کے لیے سدھایا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں بھیڑوں کی اون سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ گاندھی کو نہیں چاہیے کہ بکری کا دودھ استعمال کرے کیونکہ اس کا بکری کو اپنے پاس رکھنا اور اس کے دودھ کو کام میں لانا ایک حیوان کو غلام بنانے کے مترادف ہی تو ہے۔

فی الحال ہم اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ پیروان مذاہب ہوں یا لادینیت کے قائل، سب انسان کی بڑائی کے داعی ہیں یہ سب لوگ انسان کو کم از کم حیوانات سے یقیناً اشرف جانتے ہیں۔ اسی لیے انسان کے حقوق و آزادی کے قائل ہیں جبکہ حیوانات کی نسبت ان حقوق آزادی کے قائل نہیں۔ فی الحال ہمارا موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ وہ انسان کی اس بڑائی کے قائل کیوں ہیں اور حیوان کی بڑائی کے قائل کیوں نہیں، ہم ان حضرات سے، خواہ پابند دین ہوں یا لادین، یہ پوچھتے ہیں کہ آخر شرافت انسانی کے معنی کیا ہیں؟ کیا انسان اس لیے شرافت کا حامل ہے کہ اس میں جان ہے؟ جان تو تمام حیوانوں میں پائی جاتی ہے، مچھر بھی جاندار ہے۔ کیا انسان کی بڑائی کی وجہ اس کی آنکھیں ہیں؟ آنکھوں والے جانور بھی دنیا میں لاتعداد ہیں۔ کیا یہ حافظے کی بنا پر ہے؟ حافظہ رکھنے والے جانور بھی دنیا میں بہت ہیں۔

دراسل انسان میںکسی ایسی چیز کا ہونا لازم ہے جو حیوانات میں موجود نہ ہو اس چیز کا نام انسانیت ہے جو حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ اگر کوئی شخص انسان کی بڑائی کا قائل ہو سکتا ہے اوراس بزرگی کے باعث محترم قرار پاسکتا ہے لیکن حیوان کا خون محترم نہیں، انسان کی آزادی محترم ٹھہرتی ہے جبکہ دوسرےجانداروں کی آزادی محترمقرار نہیں دی جاتی۔ لیکن ایسے نہیں ہیں؟ لہٰذا ہم بزرگی کے حامل ہیں تو ہماری اس بات کو دلیل کے طور پر تسلیم نہیں کیاجاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یا تو ہمیں انسان کی شرافت اور امتیازی حیثیت کا قائل ہی نہیں ہونا چاہیے اور کسی کو بھی محترم نہیں ٹھہرانا چاہیے یا اگر انسان کو محترم سمجھیں تو پھر تمام جانداروں کو ایک جیسا محترم سمجھنا چاہیے۔ اس صورت میں مکھی مارنے یا انسان کو موت کے گھاٹ اتارنےکے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر اگر ہم انسان کی امتیازی حیثیت کے قائل ہونا چاہتے ہیں تو محض نسل انسانی ہونے کو معیار شرافت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

منطق قرآن کریم یہی ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ کوئی انسان صرف نسل انسانی سے ہونے کی وجہ سے دوسرے حیوان سے زیادہ محترم ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا بلکہ انسان اس لیے محترم قرار پاسکتا ہے کہ وہ انسان ہے، اس کی ذات میں عظمت انسانی کے نشانات اور مخصوص کمالات انسانی پائے جاتے ہیں۔

انسان کی انسانیت کے لوازم میں ایک چیز ایفائے عہد وپیمان ہے۔ انسان اسی وجہ سے انسان نہیں کہ وہ بول سکتا ہے بلکہ وہ اس وجہ سے انسان کہلائے گا کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کے باوجود سچ بولے۔ انسان اس لیے انسان ہے کہ وہ اپنے اختیار کے تحت معاہدہ کرے، اس کی خلاف ورزی پر قادر ہونے کے باوجود معاہدہ پر عمل درآمد کرے خواہ اس کو نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑجائے۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ انسانیت صرف انہی کیفیات پر مشتمل ہے بلکہ یہ تو انسانیت کی علامات میں سے چند علامتیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جب یہ فرمانا چاہتا ہے کہ یہ لوگ متحرک مخلوق سے پست تر ہیں اور شرافت انسانی سے محروم ہیں وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰہُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اسراء:۷۰) یعنی ہم نے بنی آدم کو بہت عزت بخشی اور انہیں خشکی و تری کے مراکب پر سوار کیا۔ یہ گھوڑے، اونٹ، گدھے سے پست تر ہیں، حشرات سے کم تر ہیں، تو دراصل انسان

کے غیرانسانی اخلاق کا ذکر فرماتا ہے۔ مقصد قرآن یہ ہے کہ جس انسان میں انسانیت کی بنیادی اقدار اور مثلاً راست گوئی، امانت داری، ایفائے وعدہ نہ ہو تو وہ محض جانور ہی ہے اور جانور سے زیادہ احترام کا مستحق نہیں۔ مزیدبرآن اگر وہ قابل اصلاح بھی نہ ہو تو اس کا انسانی معاشرے میں رہنا انسانیت کے لیے مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آیات مبارکہ جہاد کی آیات کی تمہید ہیں۔ قرآن بتلانا چاہتا ہے کہ اگر ہم جہاد کی اجازت دیتے ہیں تو یہ ان لوگوں کے خلاف ہے جو درحقیقت انسان نہیںہیں۔ قرآن پاک تمہید ہی میں بیان فرما رہا ہے کہ ایسے انسان ہر متحرک مخلوق سے پست ہیں اگر بچھو کو مارنا جائز ہے تو ان کا خون بہانا بھی درست ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ عہدوپیمان کا ذرہ بھر احترام نہیں جانتے۔ یہ نہیں کہ ایک مرتبہ عہدشکنی کرتے ہیں، بلکہ عہدشکنی ان کی سرشت میں داخل ہے۔ جب بھی عہدوپیمان کرتے ہیں تو ان کے دل میں یہی ارادہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی موقع ملا اسے توڑ ڈالیں گے۔ ایفائے عہد قرآنی آئین سے ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے: ’’اے پیغمبر! اگر آپ نے کسی مشرک کے ساتھ بھی کوئی معاہدہ کیا ہو تو اسے پورا کرو جب تک کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔ تمہیں اس کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہیے۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَہُمْ۰ۭ (توبہ :۷) جب تک وہ لوگ تمہارے ساتھ کیے گئے معاہدہ پر ثابت قدم رہیں تم بھی اس پر ثابت قدم رہو۔ ایک اور آیت میں فرماتا ہے: فَاَتِمُّــوْٓا اِلَيْہِمْ عَہْدَہُمْ اِلٰى مُدَّتِہِمْ۰ۭ (توبہ :۴) یعنی مشرکین کے ساتھ کیے گئے عہدوپیمان کو بھی مقررہ مدت تک پورا کرو تاکہ تم ایفائے عہد میں محترم و مستقل شمار کیے جاؤ۔

ایفائے عہد کے بارے میں نہج البلاغہ کا فرمان

عہدوپیمان کے بارے میںنہج البلاغہ میں حضرت امیرالمومنینؑ کا ایک ارشاد ہے جس کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت امیرالمومنینؑ کی نظر میں ایفائے عہد ایک عمومی و انسانی مسئلہ ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ اپنے ایک مشہور فرمان میں اپنے ایک والی (یعنی گورنر) مالک اشترؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔ اس میں آپ نے مالک کو خبردار فرمایا کہ ایمان کی ایک شق یہ ہے کہ لوگوں سے معاہدہ کرو اور بعد میں اس کی خلاف ورزی میں فائدہ نظر آئے تو ایسا نہ ہو کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرو۔ اس کے بعد امیرالمومنینؑ عہدوپیمان کے عمومی وانسانی پہلوئوں سے استناد فرماتے ہیں کہ اگر لوگ عہدوپیمان کی پرواہ نہ کریں تو اس سے نقصان ہوا ہے۔ خط کی عبارت اس طرح ہے: وان عقدت بینکم وبین عدولک عقدۃ اوالبستہ منک ذمۃ فحط عھدک بالوفاء اگر تم نے اپنے دشمن کےساتھ عہدوپیمان کیا ہو، یا تم نے ان

کو شرائط ذمہ کے ساتھ قبول کرلیا ہو تو اپنا عہدوپیمان پورا کرو۔ (یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ بعض اوقات اہل کتاب کو شرائط ذمہ کے ساتھ امان دی جاتی ہے اور بعض اوقات ان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس عبارت میں ''دشمن'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ اہل کتاب وغیرہ کے لیے عام ہے) وارع ذمتک بالامانۃ واجعل نفسک جنۃ دون ماا عطیت معاہدہ میں اپنے پیمان کو امانت جانو اور اپنے آپ کو اپنے قول کے لیے سپر بنائو۔ فانہ لیس من فرایض اللہ شی الناس اشد علیہ اجتماعا مع تفرق اھولھم وتشتت آرالھم من تعظیم الوفاء بالعہود کیونکہ فرائض الٰہی کی طرف ایفائے عہد سے اہم تر کوئی چیز نہیں جس کی اہمیت پر دنیا اپنے الگ الگ نظریات اور مختلف آرا کے باوجود یکجہتی سے متفق (یہ ایک الگ مسئلہ ہےکہ وہ عمل پیرا ہوں یا نہ ہوں) جو یہ ہے کہ معاہدہ کی پابندی کرنی لازم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا سرچشمہ انسان کا ضمیر ہے، اس کا تعلق کسی خاص عقیدہ سے نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ ہمارے دین میں ایسا حکم آیا ہے لہٰذا مجھے اس پر عمل کرنا ہے جبکہ دوسرا شخص کہے کہ ہمارے دین میں اس کا حکم نہیں دیا گیا لہٰذا میں اس پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہیں۔ امیرالمومنین فرماتےہیں کہ انسان کا ضمیر حکم دیتا ہے کہ وقد لزم ذلک المشرکون فی مابینھم دون المسلمین لما استوئلوا من عواقب الغدر مسلمان تو درکنار کفار بھی جو مسلمانوں سے پست تر حیثیت رکھتے ہیں، انہیں بھی اس کا ادراک ہوچکا تھا کہ عہدوپیمان کا احترام لازم ہے۔ فلا تغد ان بذمتک ولا تخیسن بعھدک ولا تختلن عدوک فانہ لایجتری علی اللہ الا جاھل شقی لہٰذا اپنے عہدوپیمان میں غداری اور قول و قرار میں بدعہدی نہ کرو اپنے عہد کو نہ توڑو ایسا نہ ہو کہ اپنے دشمن کے خلاف اس مکارانہ طرز عمل کو اختیار کرو کہ ان کے ساتھ اپنے عہد کو اپنے پائوں میں روند ڈالو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے غداری ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی غداری نہیں کرتا سوائے اس کے جو جاہل یا شقی ہو۔ وقد جعل اللہ عہد و ذمتہ امنا افضاہ بین العباد برحمتہ و حریما یسکنون الا منعتہ یہ بہت ہی عجیب و غریب تعبیرات ہیں۔ اللہ نے عہدوپیمان کی پابندی کو امن کا پیغام قرار دیا ہے کہ جسے اپنی رحمت سے بندوں میں عامکردیا ہے ایسی پناہ گاہ قرار دیا ہے جس میں لوگ بحفاظت پناہ لے سکیں۔ مزید فرماتے ہیں: ولا تعولن علی لحسن ول بعد التاکید والتوثقۃ الغرض امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ جس طرح کے حالات بھی شکار ہو خواہ انتہائی طور پر پریشان ہو اور تنگی سے نکلنے کے لیے تمہیں یہی ایک راستہ نظر آئے کہ اس انسانی امر کو پامال کردو تب بھی ایسا نہ کرو۔

یہ مقام ہے اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرنے کا اوریہ کہنے کا کہ یا اللہ چونکہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں اپنا عہد پورا کروں لہٰذا میں

عہدشکنی نہیں کروں گا مگر یہ کہ دشمن وعدہ خلافی کرے یا اس کی جانب سے وعدہ خلافی کی علامات ظاہر ہوجائیں اور ثابت ہوجائے کہ تمہارا دشمن عہدشکنی کرنا چاہتا ہے۔ اس موقع کی بھی شرائط ہیں جن کو ہم قرآنی آیات کے مطابق آئندہ بیان کریں گے۔

عہدحاضر میں اس طرح کی عہدشکنیوں کو ایک طرح کی سیاست اور عقلمندی سمجھا جاتا ہے تاہم یہ ایسی باتیں نہیں جن سے پہلے لوگ بے خبر تھے اور عہدحاضر کے لوگوں نے ان کا انکشاف کیا ہے۔ پہلے لوگ بھی یہ سب کچھ جانتے تھے۔ ان میں بھی جو بدکردار تھے وہ عہدشکنی کرتے تھے اور جو اچھے تھے وہ ایفائے عہد کے پابند تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ ابن ابوسفیان حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نام پر معاہدہ کرتا ہے، تاکید کے ساتھ اس کی پابندی کرنے کا عہدوپیمان کرتا ہے اور اس پر دستخط بھی کرتا ہے مگر جونہی برسراقتدار آتا ہے منبر پر بیٹھ کر اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے لوگو! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاہدہ کی وہ تمام شرائط جو میں نے حسن ابن علی کے ساتھ کی تھیں اب میرے پائوں کے نیچے ہیں۔'' اس نے صلح نامہ کو اپنے پائوں تلے روندتے ہوئے کہا: ''دیکھو میں اس طرح اس معاہدہ کو پامال کرتا ہوں'' لوگوں نے اپنے دل میں کہا: ''عجیب سیاستدان ہے'' جہاں اس کا مفاد معاہدہ کرنے میں ہوتا ہے معاہدہ کرلیتا ہے۔ دستخط کرنے میں ہو تو دستخط کرتا ہے، قسم کھانے میں ہو تو قسم کھاتا ہے اورجب مطلب نکال لیتا ہے تو کہتا ہے کہ سب کچھ میرے پائوں کے نیچے ہے۔'' لیکن جب ہم امیرالمومنین کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لوگ امیرالمومنین سے کہتے ہیں کہ دیکھئے معاویہ کس قدر چالاک ہے۔ امیرالمومنین علی فرماتے ہیں کہ یہ چالاکی یا دانائی نہیں، بے دینی ہے۔ بے دینی اور چالاکی میں فرق ہے۔ دیندار شخص ان سب ذرائع سے باخبر ہوتا ہے مگر ان کو استعمال نہیں کرتا، جبکہ بے دین ان ذرائع کو کام میں لاتا ہے، فرق صرف یہی ہے کہ دیندار شخص ان ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایسا نہیں ہے کہ بے دین کسی بات کا ادراک رکھتا ہو اور دین دار کو اس کا ادراک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر امیرالمومنین کا یہ فرمان پایا جاتا ہے کہ : ان العرفاء توام الصدق الغرض امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ مجھ جیسے منجھے ہوئے جہاں دیدہ تجربہ کار افراد ان تمام ذرائع سے باخبر ہیں۔ ودونھا مانع من امر اللہ ونھیہ مگر ان ذرائع کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے منافی پاتے ہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: فَاِمَّا تَثْقَفَنَّہُمْ فِي الْحَرْبِ جب بھی تم جنگ میں ان عہدشکن افراد پر قابو پالو (قرآن کی باریکیوں پر غور کیجیے قرآن تمام مواقع نہیں فرماتا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فقط جنگ کے میدان میں ان کا خون مباح جانتا ہے) اگر جنگ میں تمہارا مقابلہ ان لوگوں سے جن کو ہم متحرکین سے پست تر قرار دیا ہے، ہوجائے اور اگر تم ان کو مغلوب کرلو، ان پر فتح پالو (قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرو، عجیب و غریب تعبیر ہے) فَشَرِّدْ بِہِمْ مَّنْ خَلْفَہُمْ تو ان کے ذریعہ ان لوگوں کو پراگندہ تتربتر کردو جو ان کے عقب میں ہیں اور ان کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ ان کو ان کے پیروکاروں کے لیے عبرت کا سامان بنادو: لَعَلَّہُمْ يَذَّكَّرُوْنَ شاید وہ عبرت حاصل کریں اوران کی مانند انسانیت کا دامن نہ چھوڑیں۔ یہ تین آیات عجیب و غریب ہیں۔ تمہید کے طور پر بتاتی ہیں کہ متحرکین میں بدترین کون ہیں۔ پھر ان صفات کا ذکر کرتی ہیں جن کے باعث انسانیت ان سے مفقود ہوجاتی ہے۔ پھر ان کے قتل کا حکم دیتی ہے لیکن اس قتل کو کسی انتقامی جذبہ میں تبدیل نہیں کرتیں کہ آپ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

سزا کے دو فلسفہ ہوسکتے ہیں، ایک نفسیاتی فلسفہ جو یہ ہے کہ جس پر ظلم ہو ہو، اس کے دل میں رنجش پیدا ہوئی ہو تو اس کو تسکین مل جائے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم معاشرہ کی اصلاح ہے۔ مجرم کو کیفرکردار تک پہنچانا دوسروں کے لیے عبرت کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن عبرت کے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتا ہے کہ اب جب کہ یہ ایسے ہیں تو جانوروں سے پست تر اس مخلوق کو ختم کردو۔ ان کے ساتھ وہ سلوک کرو کہ دوسرے ان سے عبرت حاصل کریں۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَيْہِمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ۝۰ۭ اِنَّ اللہَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ

ممکن ہے آپ کہیں کہ فرض کریں ہم کسی قوم کے ساتھ پختہ معاہدہ کرتے ہیں تو کیا ہمیں اس وقت تک انتظار میں رہنا چاہیے کہ پہلے وہ اس کی خلاف ورزی کریں، پھر ہم اس معاہدہ کو نظرانداز کریں، جبکہ بعض اوقات ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس وقت تک انتظار کریں جب تک دشمن اپنا کام نہ کر گزرے اس صورت میں ہمیں نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مثلاً فرض کریں کہ ایک اسلامی حکومت کسی غیراسلامی ملک کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرلیتی ہے۔ پھر ذرائع جاسوسی درست خبر دیتے ہیں کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں جبکہ دشمن حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور تمہارے اطمینان سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ کیا ان کا طرزعمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہیں کہ چونکہ ہم نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے لہٰذا ہمیں اس کی پابندی کرنا لازم ہے؟ کیا مسلمانوں کو دشمن کے شب

خون مارنے اور پانی سر سے گزر جانے تک کچھ نہیں کرنا چاہیے؟ یا جونہی محکمہ جاسوسی اطلاع دے تو انہیں پہل کرلینا چاہیے؟ دراصل وہ بھی غلط ہے اور یہ بھی۔ قرآن فرماتا ہے کہ جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہو جب تمہیں اس کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی کے آثار نظر آئیں تو تم نہ خاموش وجامد بیٹھے رہو اورنہ ہی پہل کرو بلکہ انہیں اطلاع دے دو کہ ہمیں موصول ہونے والی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے عہدشکنی کی ہے۔ لہٰذا ہم باضابطہ طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اس وقت کے بعد ہمارے تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں اورہم پہلے معاہدہ کو کالعدم قرار دیتے ہیں تاکہ تم (مسلمان) ان کے مساوی سطح پر آجائوہ اس اعلان کے بعد جو فیصلہ چاہو کرو لیکن عدالت سے کام لوہ سو نہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو کہ وہ اپنا کام کرجائیں اورتمہیں اچانک دبوچ لیں، نہ تم پہل کرو کہ اچانک ان پر جاپڑوہ کیونکہ تمہارا یہ کام انسانیت سے خیانت اورشرافت کے منافی ہوگا۔ بلکہ ایسا کام کرو کیونکہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔ یہ دھمکی بھی ہے اور فرض انسانی بھی۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَۃً اگر تمہیں کسی قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو یعنی آثار، علامات اورموصول ہونے والی اطلاعات کی بنا پر کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو: فَانْۢبِذْ اِلَيْہِمْ تو وہ عہدنامہ ان کی طرف پھینک مارو۔ یعنی انہیں بتادو کہ اس وقت سے معاہدہ ختم ہوچکا ہے۔ عَلٰي سَوَاۗءٍ۰ۭ تاکہ فریقین برابر ہوجائیں۔ وہ جان لیں اورتم بھی جان لو کہ اب معاہدہ ختم ہوچکا ہے۔ اِنَّ اللہَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ اللہ خیانت کرنےوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ : اِنَّ اللہَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ اس مقام پر موجود ایک ان کہی بات کی علت ہے۔ یعنی مبادا کہ تم ان کو بتائے بغیر معاہدہ کی خلاف ورزی کر بیٹھو کیونکہ ایسا کرنے سے تم خائن جانے جائو گے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا۰ۭ اِنَّہُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (انفال:۵۹) اور کفار یہ خیال نہ کریں کہ وہ (مسلمانوں سے) آگے بڑھ نکلے (کیونکہ) وہ ہرگز(مسلمانوں کو) عاجز نہیں کرسکتے۔ کفار یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ اپنے ان کافرانہ اعمال، نقص عہد اورغیرانسانی اقدامات کے باعث آگے نکل گئے ہیں اور اپنے ان اعمال کے ذریعہ وہ ان حقائق سے بالاتر ہوگئے ہیں جو ہم نے بنی نوع انسان کے لیے نازل کیے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔

اس سے مقصود یہ نہیں کہ وہ اللہ کے خلاف اٹھیں گے تو اللہ انہیں مغلوب کرلے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ اس بات کو پیش نظر رکھنے سے کہ ان کے عہدشکنی و خیانت وغیرہ جیسے اعمال، سچائی، راست کردار، ایفائے عہد اور امانت کے مقابلہ میں، جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ جو شخص ان کے طریق کار پر گامزن ہوگا وہ موخرالذکر راہ پر چلنے والوں سے آگے نکل جائے گا شاید اس آیت کے مضمون کو تسلیم کرنا ہمارے لیے مشکل ہو۔ ہمارے ذہن ایک بات کے عادی ہوچکے ہیں جو اس آیت کے برعکس ہے جس میں فرمایا جارہا ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا۰ جن کافروں کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ اپنی راہ پر چلتے ہوئے سبق لے جائیں گے۔ ہم خود اس کے برعکس کہتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حق ہمیشہ آگے نہیں بڑھتا، عدلات ہمیشہ آگے نہیں نکلتی، راست بازی کا ہمیشہ دنیا میں سبقت لے جانا لازم نہیں، پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مردان حق ہمیشہ آگے نہیں نکلے، حضرت علی علیہ السلام ناکام ہوئے اور آگے نہ نکل سکے، امام حسین شہید ہوگئے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن درحقیقت ہم غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام بھی اس چیز کے درپے ہوتے معاویہ جس کے درپے تھا اور جس کو اس نے پالیا، تو یہ بات ٹھیک ہوتی۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ علی اورمعاویہ نعوذ باللہ ایک جیسے ہیں، ان کی راہیں بھی ایک جیسی ہی ہیں، یعنی حضرت علی چاہتے تھے کہ وہ سیاسی طور پر خلیفہ بننے میں کامیاب ہوجائیں اورلوگوں کی گردنوں پر مسلط ہوجائیں جبکہ معاویہ بھی یہی چاہتا تھا لیکن امیرالمومنین حضرت علی کا طریق کار الگ تھا اورمعاویہ کا الگ اپنے طریق کار کے ذریعے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیاجبکہ حضرت علی علیہ السلام اپنے طریق کار کی پیروی کرکے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوئے اور اپنے ہدف کو نہ پاسکے۔ اگر ہم دونوں کا مقصد ایک ہی قرار دیں تو اس صورت میں امیرالمومنین حضرت علی، نعوذباللہ ، معاویہ کے مقابلہ میں ناکام نظر آئیں گے۔ معاویہ کے پیش نظر حصول اقتدار تھا جس کے لیے اس نے جو طرزعمل اختیار کیا وہ بے دینی سے عبارت تھا، جبکہ حضرت علی کا مقصد بھی اگر نعوذباللہ اقتدار ہی تھا مگر آپ اس مقصد کو تقویٰ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے لہٰذا ان کو ناکام ہونا ہی تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کا مقصد معاویہ کے مقصد سے مختلف تھا۔ حضرت علی کا مقصد معاویہ جیسے لوگوں کے طریق کار کی مخالفت میں نبردآزما ہونا تھا۔ دراصل حضرت علی علیہ السلام اپنے اس مقصد میں ناکام نہیں رہے بلکہ کاملاً کامیاب ہوئے۔ حضرت خود شہید ہوگئے مگر اپنے مقصد کی حفاظت کی اور اسے زندہ رکھا۔

مشہور ہے کہ عہدقاچار میں ایک فاضل شخص جو ایک ماہر کاتب بھی تھا، شیراز سے زیارت کے لیے مشہد مقدس گیا۔ واپسی پر اس کی تمام رقم یا تو ختم ہوگئی یا چوری ہوگئی لہٰذا تہران میں پردیسی ہوتے ہوئے تہی دست بھی ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے فن یعنی کتابت کو کام میں لائے۔ اس طرح اس کا زیادہ وقت بھی ضائع نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ امیرالمومنین حضرت علی کی جانب سے مالک اشتر کے نام اس فرمان کو جس کا کچھ حصہ میں نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا ہے نہایت خوب صورت انداز میں کتابت کرے۔ لہٰذا اس نے کاغذ پر سطر بنا کر اوراق کو ترتیب دیا اوراس فرمان کو ایک مستقل نوشتہ کی صورت میں تحریر کیا تاکہ اس دور کے وزیراعظم کو بطور تحفہ پیش کرے۔

چنانچہ ایک دن وزیراعظم کے سامنے پیش ہوا جبکہ اس کے پاس آنے والے لوگوں کی تعداد پہلے ہی کافی زیادہ تھی۔ اسے تحفہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ ایک معمولی سا حقیر تحفہ ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب جانے کے لیے اٹھا تو وزیراعظم نے کہا: ''آپ تشریف رکھیں'' اس نے دل میں سوچا کہ یقیناً وزیراعظم اسے خلوت میں کچھ مرحمت فرمانا چاہتے ہیں جب حاضرین میں صرف چند اشخاص رہ گئے وقت بھی کافی گزر گیا تو وہ پھر جانے کے لیے اٹھا۔ وزیراعظم نے دوبارہ اسے مخاطب کرکے فرمایا کہ آپ تشریف رکھیں۔ جب سب لوگ چلے گئے اورصرف ملازمین رہ گئے تو وزیراعظم نے پوچھا: ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ بولا: ''کچھ بھی نہیں۔ بس یہی نوشتہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وزیراعظم نے نوکروں سے کہا کہ سب باہر چلے جائیں اورکمرہ میں کوئی نہ آئے۔ وہ بے چارا ڈر گیا کہ آخر معاملہ کیا ہے! وزیراعظم نے کہا: ''آگے آئو'' وہ آگے بڑھا تو وزیراعظم نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ''تم اسے لکھ کر میرے پاس کیوں لے کر آئے ہو؟'' وہ بولا: ''آپ ملک کے وزیراعظم ہیں اور یہ امیرالمومنین حضرت علی کا فرمان ہے آپ جیسے بااختیار حضرات کے لیے کہ لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ میر اخیال ہے کہ آپ بھی امیرالمومنین حضرت علی کے شیعہ ہیں اورایسی چیزوں کو پسند فرماتے ہیں۔ میں نے جب آپ کو تحفہ دینا چاہا تو اس سے بہتر کوئی چیز نہ پائی۔'' وزیراعظم نے کہا: ''آگے آئو'' وہ اور آگے گیا۔ وزیراعظم نے کہا: ''میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ حضرت علی جنہوں نے خود یہ فرمان تحریر فرمایا، دوسرے ہر شخص سے زیادہ اس کے پابند اور اس پر عمل پیرا رہے اس سے آپ نے سیاست میں کیا فائدہ اٹھایا کہ اب میں بھی اس پر عمل کرنے لگوں؟ حضرت علی نے خود اس مکتوب کے مندرجات پر عمل فرمایا اورہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل گیا اورمعاویہ ان پر غالب آگیا۔ یعنی حضرت علی نے خود اس دستورالعمل کو اختیار کیا

اور ناکام ہوئے۔ لہٰذا اب تم یہ میرے لیے کیا اورکیوں لکھ کر لائے ہو؟'' اس نے عرض کیا: ''اجازت دیجیے کہ میں اس کا جواب دوں۔'' وزیراعظم نے اجازت دی۔ اس شخص نے کہا: آپ نے یہی بات لوگوں کے سامنے مجھ سے کیوں نہ کہی؟'' اس نے کہا:''اگر لوگوں کے سامنے کہہ دیتا تو وہ میرا ستیاناس کردیتے۔'' اس نے پوچھا: ''پھر آپ نے لوگوں کے چلے جانے کے بعد تمام ملازمین کو بھی کیوں باہر جانے کا حکم دیا'' وزیراعظم نے جواب دیا: ''اگر ان میں سے کوئی بھی جان لیتا کہ میں حضرت علیؑ کے بارے میں ایسی جسارت کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے تباہ کرنے کے لیے تیار ہوجاتے۔''
اس شخص نے جواب دیا: ''یہی علیؑ کی فتح ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ تیرہ سو سال گزرجانے کے بعد بھی کوئی شخص معاویہ کے ذرہ برابر احترام کا قائل نہیں ہے اور اس کے مقدر میں بری طرح یاد کیے جانے کے سوا اور کچھ نہیں؟ علیؑ بھی ہم جیسے انسان ہی تو تھے۔ ان کا اس قدر احترام کیوں کیا جاتا ہے کہ اگر آپ اپنے نوکروں چاکروں کو حکم دیں کہ کسی بے گناہ کی گردن اڑا دو تو وہ اڑا دیں گے۔ لیکن آپ کی یہ جرات نہیں کہ ان کے سامنے حضرت علیؑ کے نام کی بے حرمتی کریں۔ کیا اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ امیرالمومنینؑ کو انہی صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں کہ علیؑ سچائی، درست کاری، ایفائے عہد اور خود اپنے وضع کردہ دستورالعمل کا پیکر تھے۔ امیرالمومنینؑ نے اپنی اس روش کو اپنانے کی وجہ سے خود بھی دنیا میں حیات ابدی پائی ہے اور ان کو بھی تحفظ بہم پہنچادیا۔ اگر آج دنیا میں کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو انسانی اصولوں پر عمل پیرا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ حضرت علیؑ نے یہ نیک دستورالعمل تحریر فرمایا اور اس کے مطابق عمل بھی کیا۔ اگر حضرت یہ دستورالعمل تحریر فرماتے یا اس پر عمل پیرا نہ ہوتے تو بہت زیادہ نقصان کا موجب ہوتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس معاشرہ کو آپ نے اپنی اسی سیاست سے محفوظ رکھا ہوا ہے؟ اگر لوگ چوری نہیں کرتے ہیں یہ نہیں کہ صرف آپ کے خوف سے نہیں کرتے۔ نوے فیصد لوگ جو چوری نہیں کرتے وہ حضرت علیؑ ان کے فرامین اور حضرت علیؑ جیسے دوسرے رہنمائوں کے فرامین کی وجہ سے چوری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگر نوے فیصد لوگ بدکاری نہیں کرتے، آپ کے ناموس پر ہاتھ نہیں ڈالتے تو یہ سب حضرت علیؑ اور ان کے ارشادات ہی کی وجہ سے ہے آپ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حضرت علیؑ ناکام ہوگئے۔''

اسی لیے قرآن مجید فرماتا ہے: وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَبَقُوْا۰ۭ اِنَّہُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ہمیں اپنے ذہنوں سے یہ خیال نکال دینا چاہیے کہ حق آگے نہیں بڑھتا، لوگ ظلم کے آگے سرجھکاتے ہیں اور دنیا کی بنا ہی ظلم و باطل پر استوار ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی حود بھی جو باقی ہیں انہی

محکم اصولوں کی بدولت ہیں جن کو حق، سچائی اور راستبازی کے پیروکاروں نے قائم کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافر ہم پر فتح نہیں پاسکتے۔ کافر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی تو لڑنا نہیں چاہتے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا طرزعمل ہمارے طریق کار کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پس چاہیے کہ ہمارے ہی راستے پر گامزن رہنے کی کوشش کی جائے۔

وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْـتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْہِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّاللہِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِہِمْ۝۰ۚ لَا تَعْلَمُوْنَہُمْ۝۰ۚ اَللہُ يَعْلَمُہُمْ۝۰ۭ (انفال:۶۰) اور (مسلمانوں ان کفار کے مقابلہ کے) واسطے جہاں تک تم سے ہوسکے (اپنے بازو کے) زور اوربندھے ہوئے گھوڑوں سے (لڑائی کا) سامان مہیا کرو۔ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے سوا دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھالو گے جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ تو ان کو جانتا ہے۔

اب سوچنا ہوگا کہ ہمارطریق کار کیا ہو؟ کیا ہمارا طریق کار صرف یہ ہونا چاہیے کہ اپنے عہد کو پورا کریں، راست گو بنیں، نیک چلن رہیں، اللہ کی عبادت کریں، مسجد میں جاکر مستقل طور پر دعا مانگتے رہیں؟ صرف اسی قدر ہرگز کافی نہیں۔ ہمارا طریق کار صرف معنوی امور سے ہی عبارت نہیں بلکہ مادی امور بھی اس میں شامل ہیں۔ اسلام ایک ہمہ گیر طریق کار کا حامل ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْـتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے جہاں تک تمہارے لیے ممکن ہو طاقت مہیا کرو۔ ہم ان باتوں کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ ’’ویل ڈیورانٹ‘‘ کہتا ہے: ’’کسی دین نے اپنے پیروکاروں کو اس حد تک طاقت و قوت کی طرف دعوت نہیں دی جس قدر اسلام نے دی ہے۔‘‘ آیہ مبارکہ فرما رہی ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے جہاں تک ممکن ہو قوت مہیا کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ فلاں فلاں چیز جمع کرو۔ بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے اس آیت سے ایک عمدہ نکتہ نکالا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ گذشتہ آیت میں صرف پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہورہا ہے جبکہ اس آیت کے تمام لوگ مخاطب ہیں۔ گذشتہ آیات اس طرح تھیں: اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللہِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَہُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۵۵ۚۖ اَلَّذِيْنَ عٰہَدْتَّ مِنْہُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَہْدَہُمْ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار بدترین ہیں (باوجود اس کے) پھر ایمان نہیں لاتے۔ (اے رسولؐ) جن لوگوں سے تم نے عہدوپیمان لیا تھا، پھر وہ لوگ اپنے عہد کو ہر بار توڑے ڈالتے ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا اورانہوں نے اس کی خلاف ورزی کی: فَاِمَّا تَثْقَفَنَّہُمْ فِي الْحَرْبِ (اگر وہ لڑائی میں تمہارے قابو میں آجائیں) جب اورجہاں آپ ان کو مغلوب کرلیں تو ایسا کیجیے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَۃً (اور اگر کسی قوم کی

خیانت کا خوف ہو) اورجب مسلمانوں کے حاکم کی حیثیت سے آپ کو ان کی خیانت کا اندیشہ ہو تو معاہدہ ختم کردیجیے۔ یعنی معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیجیے۔

ان تمام آیات میں پیغمبراکرم کی ذات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن جب قرآن یہاں پہنچتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ اے پیغمبر! اے مسلمانوں کے حاکم! اے مسلمانوں کے والی! آپ جہاں تک ممکن ہو طاقت کا سامان مہیا کریں۔ اب ایک دم تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا جارہا ہے: ''اے مسلمانو! جہاں تک ممکن ہو قوت مہیا کرو۔'' کیونکہ قوت ایسی قوت نہیں جسے صرف مسلمانوں کا سربراہ ہی مہیا کرنے کا پابند ہو بلکہ اس کا ایک حصہ لوگوں کے تیار ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جنہیں سیکھنا ہوتا اور تیار ہونا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہاں بھی مسلمانوں کے سربراہ پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے تاہم یہاں زیادہ اہمیت کے باعث مسلمانوں کے سربراہ کو مخاطب کرنے سے صرف نظر کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو مخاطب فرماتا ہے: وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ جہاں تک ہوسکے قوت مہیا کرو۔ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ بندھے ہوئے گھوڑوں کو بطور مثال بیان فرماتا ہے، جو جنگی سازوسامان کے مہیا ہونے کی دلیل و مظہر ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں گھوڑا جنگ میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ جب کوئی لشکر تیار کرنا ہوتا تو اس کی تیاری کا ایک حصہ بندھے ہوئے تیار گھوڑے ہوتے تھے۔ جب چلنے کا اعلان کیا جاتا تو فوجی فوراً ان گھوڑوں پر سوار ہوکر چل پڑتے۔ تُرْہِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّاللہِ وَعَدُوَّكُمْ اس طرح تمہاری دھاک اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کے دلوں پر بیٹھ جائے جب تمہاری قوت کا اندازہ کریں تو ان کے دل کانپ اٹھیں۔ اوروہ تمہیں اہمیت دینے پر مجبور ہوجائیں۔ ایک یورپین معاصر فلسفی کا ایک خوبصورت جملہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تلوار کے بغیر کوئی معاہدہ کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ بات بہت بنیادی ہے کہ تم خود اس معاہدہ کی پابندی کرو مگر دوسرے فریق کی طرف سے ایفائے عہد کے بارے میں مطمئن نہ ہوجاؤ۔ تمہاری اپنی قوت کو تیار ہونا چاہیے تاکہ اگر فریق مخالف معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو طاقت کے ساتھ اس کا سامنا کرو۔

اس فلسفی نے گویا قرآنی آیات سے یہ بات سیکھی ہے۔ قرآن اس انسانی عمل یعنی ایفائے عہد کی اس قدر تاکید کے بعد درحقیقت یہ فرما رہا ہے کہ تم عہدوپیمان کو آخر وقت تک نبھائو لیکن دوسروں کی انسانیت پر بھروسہ کرکے مطمئن نہ ہوجاؤ۔ اپنی طاقت تیار رکھو تاکہ اگر وہ طاقت لے کر تمہارے سامنے آئیں تو تم بھی طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ

کروہ اس طریقہ سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کے سامنے اپنی شخصیت اس طرح ثابت کرو کہ جب بھی وہ تمہارے بارے میں سوچیں تو ان کے دل کانپ اٹھیں: وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِہِمْ۰ۚ لَا تَعْلَمُوْنَہُمْ۰ۚ بہت سے ایسے دشمن ہیں جن کو تم نہیں پہچانتے، مگر اَللہُ يَعْلَمُہُمْ۰ۭ اللہ ان کو پہچانتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللہِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (انفال:۶۰) اوراللہ کی راہ میں جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ پوراق پورا بھرپائو گے اور تم پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کریم انفاق کی بات پیش فرماتا ہے کیونکہ طاقت مہیا کرنے کے لیے مال خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اورجان فدا کرنے کی بھی۔ شاید قرآن کی زیادہ توجہ مال خرچ کرنے کی جانب ہے۔ یاد رہے کہ جو کچھ بھی تم مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو وہ ہرگز ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تمہیں اس کا پورا پورا معاوضہ عطا فرمائے گا۔ یہ خیال نہ کرو کہ مال تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہرگز نہیں، کیونکہ تم پر ہرگز ظلم نہیں ہوگا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ (انفال:۶۱) (اور اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو) یہاں تک تمام گفتگو جنگ اورخائن دشمن کا مقابلہ کرنے کے بارے میں تھی۔ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کے معنی ہیں کہ اس نے سلم (یعنی صلح) کے لیے اپنے پر پھیلائے یعنی اس نے صلح کی طرف میلان ظاہر کیا۔ شاید یہ لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب لڑنے والے پرندے مثلاً مرغ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں لڑنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے پر زمین پر پھیلا دیتا ہے یعنی اب میں لڑنا نہیں چاہتا۔ مراد یہ ہے کہ اگر دشمن صلح کی جانب مائل ہو تو آپ بھی سختی سے پیش نہ آئیں۔ آپ بھی صلح کے میلان کا اظہار کریں اس کی تفسیر آئندہ بیان ہوگی۔

وصلی الہ علی محمد وآلہ الطاہرین

گیارھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَہَا وَتَوَكَّلْ عَلَي اللہِ۰ۭ اِنَّہٗ ہُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۶۱ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللہُ۰ۭ ہُوَالَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۶۲ۙ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِہِمْ۰ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰكِنَّ اللہَ اَلَّفَ بَيْنَہُمْ۰ۭ اِنَّہٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۶۳ يٰٓاَيُّہَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللہُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۶۴ۧ

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو (کیونکہ) وہ بے شک (سب کچھ) سنتا، جانتا ہے۔ اور اگر وہ لوگ تمہیں فریب دینا چاہتے ہیں تو (کچھ پروا نہیں) اللہ تمہارے لیے یقینی کافی ہے۔ (اے رسولؐ) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اورمومنین سے تمہاری تائید کی۔ اور اسی نے ان (مسلمانوں) کے دلوں میں باہم ایسی الفت پیدا کردی کہ اگر تم جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب خرچ کرڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا نہ کرسکتے مگر اللہ ہی تھا جس نے ان میں باہم الفت پیدا کی۔ بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔ اے رسولؐ تم کوبس اللہ اورجو مومنین تمہارے تابع فرمان ہیں، کافی ہیں۔ تم مومنین کو جہاد کے واسطے آمادہ کرو۔

گذشتہ آیات میں ہم نے ان آیات کو پڑھا جن کا تعلق اس کیفیت سے تھا کہ کن لوگوں کے قتل اور کن سے جہاد کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ سلسلہ آیات اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللہِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں...) سے شروع ہوا اب ہم ان آیات تک پہنچے ہیں جن کی میں نے آج رات تلاوت کی ہے۔ قرآن نے پہلے ان کی ایک غیرانسانی صفت کا ذکر کیا جو عبارت تھا نقض عہد سے اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ باربار۔ اس کے بعد دوسرے حصے آئے جن کو ہم یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ وہ سب ان سے جنگ کرنے کے بارے میں اور اس بارے میں تھیں کہ یہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ ان سے جنگ کی جائے کہ یہ قتل و خون ریزی ہی کے لائق ہیں۔

یہ آیت ان ہی سے صلح و آشتی کے مسئلے کو بیان فرما رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ صفات کے حامل لوگ جنگ و مخالفت پر ہی آمادہ ہوں تو ذمہ داری وہی ہے جس کا ذکر ہوچکا۔ لیکن اب اگر یہ لوگ صلح کی طرف میلان ظاہر کریں تو پیغمبراکرم کی ذمہ داری کیا ہوگی!
یہ مسئلہ پیغمبراکرم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کا سربراہ جو اسلامی اصولوں کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہو، اس کی ان حالات میں ذمہ داری کیا ہوگی! قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر وہ صلح کرنے پر مائل ہوں، اگر وہ جنگ بندی کرنا چاہیں، دورحاضر کی اصطلاح میں مل جل کر رہنا چاہیں، ترک جنگ کا ارادہ ظاہر کریں، اسے قبول کرلو اورصلح کی طرف مائل ہوجائو۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَہَا اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی ایسا ہی کرو یعنی تم بھی اس پر آمادہ ہوجائو۔ اس مقام پر جنح کا لفظ آیا لفظ جنح جس کے معنی پرندہ کے ہیں اس نے میلان ظاہر کیا۔ اس مقام پر یہ جو فرما رہا ہے: جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ گویا یہ تشبیہ ہے کہ پرندہ پرواز کے دوران جب کسی طرف مڑنا چاہتا ہے تو اس کے پر چاروناچار اس طرف مڑ جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا بھی یہی طریقہ ہے۔ پس اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو صلح و آشتی کی جانب مائل کریں تو تم بھی یہی کرو۔ پھر فرماتا ہے: وَتَوَكَّلْ عَلَي اللہِ۝۰ۭ اِنَّہٗ ہُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُکیونکہ درحقیقت جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے عہدوپیمان پر بھروسہ نہیں کیاجاسکتا۔ انہوں نے صلح کا اعلان کیا ہے تو ہم بھی صلح و آشتی کے خواہاں ہیں۔ مگر ان پر اعتماد کیسے کیا جائے اورکیسے یقین کرلیا جائے! اس مقام پر قرآن فرماتا ہے: ''خوف نہ کھائو اور اللہ پر توکل کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' اِنَّہٗ ہُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُاللہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی۔ یعنی تم اپنا کام حق کی بنیاد پر انجام دو۔ اللہ خود اپنے ذرائع کے ساتھ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ تم اصولوں کے مطابق عمل کرو اور باقی باتوں میں اللہ پر توکل کرو بعد والی آیہ مجیدہ اسی بات سے متعلق ہے کہ اللہ پر توکل کرو اوردھوکے و فریب سے نہ ڈرو۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللہُ۝۰ۭ اگر وہ لوگ تمہیں چکمہ دینا چاہیں، اگر ان کا یہ صلح و آشتی کا اظہار دھوکا و فریب ہو تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہا جارہا ہے کہ دشمن کے کہنے پر بھروسہ نہیں کیاجاسکتا خواہ انسان تحقیق و جستجو ہی کیوں نہ کرلے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ آیا دشمن چکمہ دینے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیںَ بات یہ ہے کہ بعض چیزیں مخفی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھایا جائے تو تم اس احتمال کے پیش نظر اسے نہ ٹھکرا دو کہ شاید یہ دھوکا وفریب بھی ہو۔ یہ جملہ کہ: ''اللہ پر توکل کرو۔ اگر وہ تمہیں دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمہارے ساتھ ہے'' خوفزدہ نہ ہو، یہ اس

لیے ہے کہ قرآن مجید پیغمبراکرم (نہ صر ف پیغمبراکرم، البتہ پیغمبراکرم کو مخاطب کیا گیا ہے اس سے زیادہ تر مقصود وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے سربراہ بنتے ہیں) سے کہنا چاہتا ہے کہ اگر دشمن تمہاری جانب صلح کا ہاتھ بڑھائے تو تم اس سوچ میں نہ پڑجائو کہ کہیں یہ جھوٹ نہ ہو، کہیں دھوکا و فریب نہ ہو، اورتم اسی احتمال کے تحت صلح سے انکار نہ کردوہ تم بھی ان کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائوہ ان اندیشوں کے بارے میں کہ جو ہر کسی کو لاحق ہوتے ہیں اورکوئی شخص بھی کامل طورپر یقین نہیں کرسکتا کہ دشمن سچ کہہ رہا ہے، اللہ کو یاد کرو اوراسی پر توکل کرو فَاِنَّ حَسْبَكَ اللہُ ۰ اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

ہُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ماضی میں بھی ایسا ہی تھاہ اے پیغمبر! کیا ماضی میں ظاہری افرادی قوت اورجنگی سازوسامان نے تمہاری مدد کی تھی؟ ماضی میں تائید ایسی ہی تمہارے ساتھ تھیہ آئندہ بھی ایسا ہوگاہ ہُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ اللہ وہی ہے جس نے اس نصرت کے ساتھ جو آسمان سے نازل فرمائی تھی (ظاہری طور پر آسمان سے نازل ہونے والی نصرت سے جنگ بدر میں فرشتوں کے نازل ہونے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے) اورزمین پر موجود افرادی قوت یعنی مومنین کے ذریعہ تمہاری مدد کی تھیہ لہٰذا اب بھی ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کا مقام نہیںہ ہُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ

ہم نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ پورا قرآن توحید خالص ہے اور اس میں ہر مقام پر پروردگار عالم کی مشیت مطلقہ کی بات کی گئی ہےہ مگر اس کے باوجود ہمیشہ شرائط و اسباب کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے یعنی وہ شرائط و اسباب کو صحیح گردانتا ہےہ یہ نہیں کہتا کہ اللہ وہ ہے جس نے سبب کے بغیر تمہاری تائید کی تھی بلکہ اس کا سبب ذکر فرماتا ہےہ اس نے آسمانی اسباب یعنی فرشتے نازل کرنے کے ساتھ بھی تمہاری تائید فرمائی اور زمین کے اسباب یعنی باایمان افراد کے ساتھ بھی بِالْمُؤْمِنِيْنَ اس کے بعد قرآن کریم مومنین کے حوالے سے ایک نکتہ کی یاددہانی کرا رہا ہے جو بہت اہم ہے اور وہ عبارت ہے اس خلوص اور اتحاد سے جو صدراسلام کے مسلمانوں میں ایمان کی بنیاد پر وجود میں آیا تھاہ

اشتراک عمل و ذہنی ہم آہنگی

انسان کی شخصی زندگی میں عامل اول اختلاف ہے اصولی طور پر کوئی دو افراد آپس میں اتحاد رکھتے ہوئے نہیں پائے جاتےہ بالفاظ دیگر

خارجی عوامل سے، جو انسان کے وجود پر حکم فرما ہیں ، صرف نظر کرتے ہوئے اگر انسان اور فقط اس کی داخلی قوتوں ہی کو لیا جائے تو اصولی طورپر ان میں اختلاف پایا جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ میں اپنی فطرت و سرشت کے تحت ذاتی منافع کے حصول اور اپنے آپ کو نقصانات سے بچانے کی کوشش میں ہوں۔ آپ بھی فطرتی طور پر اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور اپنی ذات کو نقصانات سے بچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہی بات بعض مقامات پر میرے اور آپ کے درمیان اختلاف و تصادم کا باعث بنتی ہے۔ کوئی منفعت ایسی ہوسکتی ہے جسے میں بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں اورآپ بھی (یہیں سے تصادم و اختلاف وجود میں آتے ہیں۔ یہ اصل اولی ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا لیکن ایک ایسا عامل سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے اختلاف کی یہ اصل اول نہیں رہتی بلکہ دوسری اصل بن جاتی ہے۔ یہ عامل لوگوں کو آپس میں متحد کرتے ہیں۔ مثلاً ہم چند اشخاص ایسے ہیں جسے ہم میں سے کوئی اکیلا حاصل نہیں کرسکتا۔ آپ بھی تن تنہا اس کو حاصل نہیں کرسکتے اورمیں بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ آئیے مل کر کوشش کریں تاکہ سب اس منفعت کو حاصل کریں اور بعد میں ہم اس مفاد کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں یہ عامل ہمارے باہمی اتحادواتفاق کا موجب بنتا ہے۔ یا ہمارا کوئی مشترکہ دشمن نکل آتا ہے لہٰذا ہم اس کا مقابلہ کرنے اوراپنا دفاع کرنے کے لیے آپس میں متحد ہوکر ایک متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ لیکن ایسے امور ہمیں متحد نہیں کرتے بلکہ ان امور میں ہم مل کر کام کرتے ہیں۔ جب چند سرمایہ دار نفع بخش کاروبار کے لیے سر مایہ اکٹھا کرتے ہیں تو وہ مل کر کام کرتے ہیں، ان میں ہم آہنگی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ان کی طبائع متحد نہیں ہوتیں۔ صرف زیادہ نفع کے حصول کی خاطر مل کر کام کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی اس زیادہ نفع کا سلسلہ ختم ہوتا ہے ان کا باہمی تعاون بھی ختم ہوجاتا ہے۔ جونہی وہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ نفع اٹھانے کی خاطر بعض افراد کو راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے اسی وقت ان کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات انسان میں ایسے عوامل جنم لیتے ہیں جو انسانوں کو واقعی متفق و متحد کردیتے ہیں۔ یہ عوامل نہ صرف انہیں مل کر کام کرنے کے قابل بناتے ہیں بلکہ ان کے ضمائرہ قلوب میں بھی ہم آہنگی پیدا کردیتے ہیں۔ قلوب کی ہم آہنگی متحدہ ہوکر کام کرنے اورہم زبان ہونے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنے ہم کار فرد کے بارے میں بھی وہی سوچتا ہے جو اپنے بارے میں سوچتا ہے، اپنے ہم کار کو اسی قدر دوست رکھتا ہے جس قدر خود اپنے آپ کو بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ اس کو دوست رکھتا ہے اور دوسرے کو اپنے پر ترجیح دیتا ہے۔

قرآن مجید کی آیت فرما رہی ہے: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ كَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۰ (حشر:۹) یعنی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں ہر چند کہ خود مفلسی و تنگدستی سے دوچار ہوں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے کہ لوگ فقط مفادات کے حصول یا نقصانات سے بچائو کی خاطر آپس میں مل کر کام نہ بھی کریں لیکن روحانی طورپر واقعی اس حد تک متحد ہوجائیں کہ ان کی روحیں ایک ہوجائیں۔ پھر بعض اوقات کچھ لوگ مل کر کام تو کرتے ہیں لیکن ان میں قلبی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوپاتی۔ دراصل قلبی ہم آہنگی اس بات پر موقوف ہے کہ افراد کی ضمائر میں ایسا جذبہ پیدا ہوجائے جس کے باعث وہ آپس میں ایک دوسرے کو ایک ہی سمجھنے لگیں گویا اپنے آپ کو ایک ہی پیکر کے مختلف اعضا جاننے لگیں۔ اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی میں اصل اول اختلاف رائے ہے۔ پھر اگر ان میں اتحاد وجود میں آتا ہے تو وہ مل کر کام کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، حقیقی اتحاد نہیں ہوتا، وہ بھی ان خاص حالات میں مل کر کام کرتے رہتے ہیں جب ان کے مفادات اس کا تقاضا کریں۔

لیکن بعض اوقات ایک خارجی جذبہ انسان کے قلب و ضمیر پر قابض ہوجاتا ہے جو افراد کو آپس میں متحد کردیتا ہے۔ ان کے قلوب میں واقعی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ جذبہ بعض اوقات قومی ہوتا ہے، مثلاً وہ جذبہ جو ایک وطن، ایک زبان، ایک قوم ہونے کی وجہ سے ابھرتا ہے اوریہ زیادہ تو نہیں البتہ کسی حد تک قلوب کو نزدیک لے آتا ہے۔ مگر وہ عامل جو لوگوں کے قلوب و ضمیر میں واقعی ہم آہنگی و یگانگت پیدا کرتا ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ جس قدر اتحاد ایک دین کے پیروکاروں اور ایک جیسے عقائد رکھنے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے دنیا کی تاریخ نے کبھی بھی دوسری جماعتوں کے درمیان اس قدر اتحاد کی نشاندہی نہیں کی۔ اس جذبہ کے تحت مختلف افراد اپنے آپ کو ایک ہی اکائی کے عناصر جاننے لگتے ہیں، حالانکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ افراد طبعی طور پر اپنے آپ کو ایک جانیں۔ صدراسلام میں ہونے والے ایک غزوہ، غالباً غزوہ موتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک شخص زخمیوں کے درمیان اس لیے گھوم رہا تھا کہ شاید کسی زخمی کو بچا سکے۔ وہ ایک شخص کے پاس پہنچا جو بہت پیاسا تھا۔ (عرب کی شدید گرمی دینے کے لیے بڑھا تو اس نے اپنے ایک اور زخمی ساتھی کی جانب اشارہ کیا) یہ گھومنے والا پانی کا ایک جام ڈھونڈ لایا۔ جب اسے دینے کے لیے بڑھا تو اس نے اپنے ایک اورزخمی ساتھی کی جانب اشارہ کیا کہ اسے دے دو۔ وہ کارکن دوسرے زخمی کے پاس گیا۔ اس نے بھی اپنے ایک اور ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے دو۔ (بعض مورخین نے نو تک کی تعداد بتائی ہے) وہ تیسرے آدمی کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ جان بحق ہوچکا ہے۔ دوسرے کے

پاس واپس آیا تو دیکھا کہ وہ بھی ختم ہوچکا تھا۔ پھر پہلے کے پاس پہنچا تو اسے بھی جان بحق پایا۔ اس حد تک ہمدردی کا پیدا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان حقیقتاً دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے۔ امیرالمومنین حضرت علی کا فرمان ہے: اوا بیت مبطانا وحولی بطون غرثی واکبار حری اوا کون کما قال القائل

وحسبک داء ان تتبت ببطنۃ

وحولک اکباد تحسن الی القد

میرے لیے یہی درد بہت ہے کہ میں شکم سیر ہوکر سوئوں جبکہ میرے اردگرد بھوکے ہوں۔

یہ مسئلہ (یعنی قلبی ہم آہنگی) اس حد تک اہم ہے کہ قرآن کریم اسے نبی اکرم پر لوگوں کے لیے بہت بڑی نعمت سے تعبیر فرماتا ہے بالخصوص اس لیے کہ عرب کے لوگ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں سے زیادہ پراگندہ و منتشر رہتے تھے۔ ان میں کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے شدید اختلافات پائے جاتے تھے۔ کمیت کے لحاظ سے اس طرح کہ آپس میں لڑنے والے دونوں قبیلے اندرونی اختلافات کا شکار ہوتے تھے کیفیت کے لحاظ سے ایسا تھا کہ ان کی عداوت، غیبت، ایک دوسرے پر تنقید یا اقتصادیات تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان میں تلوار چلتی تھی، قتل و خون ریزی ہوتی تھی اورمغلوب ہونے والوں کی اسیری کی نوبت بھی آجاتی تھی مدینہ میں اوس و خزرج نامی دوقبائل رہتے تھے۔ ان کے ساتھ یہودی قبائل بنی قریظہ ، بنی نضیر اوربنی عطفان بھی آباد تھے۔ یہودی بھی باہمی پھوٹ کا شکار تھے۔ بنی نضیر بنی قریظہ کے دشمن تھے، بنی قریظہ بنی نضیر کے اور بنی عطفان ان دونوں کے دشمن تھے جبکہ سب یہودی اوس و خزرج دونوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ اوس و خزرج کا سلسلہ نسب ایک ہی شخص تک جاپہنچتا تھا ۔ وہ دو بھائیوں کی اولاد تھے مگر آپس میں نہ ختم ہونے والی جنگوں میں الجھے ہوئے تھے مولاناروم فرماتا ہیں:

دو قبیلہ اوس و خزرج نام داشت

ہر یکیشان جام خون آشام داشت

کینہ ھای کہنہ شان از مصطفی

محو شد در نور اسلام و صفا

ترجمہ اشعار: اوس و خزرج نام کے دو قبیلے تھے، دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کے کینے اور قدیم دشمنیاں حضورمحمد مصطفیؐ کے طفیل نور اسلام سے منور ہوکر ختم ہوگئے اور صلح و صفائی نے ان کی جگہ لے لی۔

ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبرؐ! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری جانب صلح و سلامتی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو اسے نہ ٹھکرائو۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَہَا وَتَوَكَّلْ عَلَي اللہِ۝۰ۭ اِنَّہٗ ہُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہاں تک کہ فرماتا ہے: ہُوَالَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِہِمْ۝۰ۭ اللہ وہی تو ہے جس نے ان مومنین کے دلوں میں الفت پیدا فرمائی، ان میں اتحاد اوریگانگت پیدا کی۔

کیا دولت یا کسی اور طاقت مثلاً زور کے بل بوتے پر ایسا اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے؟ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِہِمْ۝۰ۭ اللہ وہی ہے جس نے ایمان کی طاقت کے ساتھ ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ دوسری کسی طاقت کے ساتھ اس الفت کو وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِہِمْ اگر ایمان نہ ہوتا اورتم ان کو مال کے ذریعہ متحد کرنا چاہتے تو اگر دنیابھر کی دولت انہیں دے دیتے تب بھی ان کا متحد ہونا محال تھا، بلکہ دولت مزید اختلافات کا موجب بن سکتی تھی۔ دولت کی کشش سے ایک جماعت کو اپنے گرد جمع تو کیا جاسکتا ہے لیکن دولت دے کر لوگوں کو بھائی بھائی نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے وَلٰكِنَّ اللہَ اَلَّفَ بَيْنَہُمْ۝۰ۭ اِنَّہٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ مگر اللہ نے ایمان کی طاقت سے ان میں باہمی الفت پیدا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے، فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ! ہم نے تمہارے لیے قوت پیدا کی ہے۔ آخر کس ذریعے سے قرآن یہاں گذشتہ بات کو دہراتا ہے يٰٓاَيُّھَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللہُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اے پیغمبرؐ! ان دھوکوں چالوں سے نہ ڈرو۔ تمہارے لیے آللہ اور یہ مومنین کافی ہیں جو تمہارے پیروکار اور خداداد قوت کے مالک ہیں۔ پس آپ صلح و سلامتی سے نہ گھبرائیں۔ اس کے ساتھ جیسا کہ قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے قرآن حکیم نہ تو کلی طور پر تمام حالات میں صلح کا داعی ہے قرآن کریم خاص حالات میں صلح کی تجاویز پیش کرتا ہے، پیغمبراکرمؐ سے اصرار اور آنحضرتؐ کو تاکید فرماتا ہے کہ صلح و سلامتی سے خوف نہ کھائیں اور یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس کے برعکس اگر پتہ چل جائے کہ فریق مخالف عہدشکنی کرنا چاہتا ہے اور حالات ویسے ہوں جن کا ذکر میں گذشتہ ہفتے کرچکا ہوں تو پھر قرآن کریم ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے اس آیت کے بعد فرماتا ہے: يٰٓاَيُّھَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ۝۰ۭ (انفال:۶۵) اے پیغمبرؐ! ایمان والوں کو جنگ کی ترغیب دو ممکن

ہے کوئی کہے کہ اس مقام پر ان دو باتوں میں کیا باہمی تعلق ہے کہ ایک طرف تو قرآن صلح کی بات کررہا ہے اور دوسری طرف ہدایت کررہا ہے کہ مومنین کو جنگ کی طرف رغبت دلائو۔ اب میں اس مطلب کی آپ کے لیے وضاحت پیش کرتا ہوں۔

قرآن مجید کی آیات اورپیغمبراکرم کی سنت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمان یا کم از کم مسلمان مجاہدین جہاد کے لیے ہر وقت پورے طور پر آمادہ و تیار رہتے تھے۔ گذشتہ آیات میں ہم بیان کرچکے ہیں: وَاَعِدُّوْا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ اس کے معنی یہ نہیں کہ جنگ کے موقع پر طاقت بہم پہنچائو، بلکہ ارشاد ہے کہ قوت تیار رکھو، یعنی قوت و طاقت پہلے سے ہی مہیا کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پانچ دن میں جنگ کی ضرورت محسوس ہو جائے۔ اس صورت میں پانچ دن کے اندر تو طاقت مہیا نہیں کی جاسکتی۔ اسلام ہر وقت تیار رہنے اور طاقت و قوت مہیا رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن جنگ کا حکم خاص حالات میں صادر کرتا ہے...مگر بعد میں فرماتا ہے کہ مسلمانوں کو جنگ و جہاد کی رغبت دلاتے رہو مسلمان کا ذہن جنگ کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ پیغمبراکرم سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مضمون بہت عجیب و غریب ہے۔ آنحضرت فرماتے ہیں: من لم یغز ولم یحدث نفسہ بغزو مات علی شعبۃ من النفاق یعنی ایسا شخص دل کی گہرائیوں میں ایک طرح کی منافقت کا وجود رکھتا ہوگا جس شخص نے جہاد نہ کیا ہو یا کم از کم جہاد کی آرزو دل میں نہ رکھی ہو(اپنے نفس کے ساتھ جہاد کی بات نہ کی ہو) یعنی اس کے دل میں جہاد کی خواہش ہی پیدا نہ ہوئی ہو تو ایسا شخص ایک طرح کی منافقت کی موت مرتا ہے۔

اس حدیث میں جس منافقت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس منافقت سے مختلف ہے جس کا حامل خود آگاہ ہوتا ہے کہ وہ منافق ہے۔ یہ ایک ایسی دورنگی ہے کہ انسان خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ مثلاً ہماری عادت بن چکی ہے کہ ہم زبانی طو پر حضرت امام حسین کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: السلام علیک وعلی الارواح التی حلت بعنائک فیا لیتنا کنا معک فنفوز فوزا عظیما کاش ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے، (چونکہ ہم عربی نہیں جانتے اس لیے ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے۔ شاید اس جملہ کو بھی ہم تہ دل سے ادا نہیں کرتے) تو عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔ مگر یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ کیا واقعی اگر معرکہ کربلا جیسا واقعہ پیش آجائے، یعنی امام حسین تشریف لے آئیں تو ہم جنہوں نے عمربھر امام حسین کے نام کے نعرے لگائے ہیں، ان پر گریہ کیا ہے، حسین حسین کی گونج میں ماتم کیا

ہے، ایسے موقع پر ثابت قدم رہیں گے؟ ہم تصور تو یہی کرتے ہیں مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔

ایک بلند پایہ شیعہ عالم کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ قم کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا کہ امام حسین سے منقول اس جملے ''مجھے اپنے اصحاب سے بہتر کسی کے اصحاب دکھائی نہیں دیتے'' کے بارے میں فیض مرحوم نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی بات حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمائی ہو۔ پوچھا گیا آپ کا یہ خیال کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے ابھی کیا ہی کیا تھا کہ امام حسین فرماتے کہ ان سے بہتر کوئی اصحاب نہیں۔ جنہوں نے امام حسین کو قتل کیا وہ واقعی بہت برے تھے۔ اورجنہوں نے امام حسین کا ساتھ دیا انہوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا۔ ان کی جگہ جو مسلمان بھی ہوتا جب اس سے کہا جاتا کہ نبی کا نواسہ اور وقت کا امام دشمنوں کے نرغہ میں بے یارومددگار گیا ہے تو فوراً مدد کو دوڑپڑتا۔

ایک رات اس عالم نے خواب میں دیکھا کہ کربلا کا میدان ہے، ایک طرف امام حسین بہتر افراد کے ساتھ موجود ہیں اور دوسری طرف دشمن کے تیس ہزار سپاہی ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ نماز ظہر کا وقت ہے اورامام نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسی عالم سے فرمایا: ''آپ ہمارے سامنے کھڑے ہوجائیں تاکہ ہم نماز پڑھ لیں۔'' (یہ ایسا وقت تھا جس طرح سعید ابن عبداللہ حنفی اور دو دیگر افراد نے خود کو امام کے لیے ڈھال بنایا تھا)۔ دشمن تیر چلا رہا تھا۔ یہ آگے بڑھ کر کھڑے ہوگئے۔ دشمن کا پہلا تیر آتے دیکھ کر یہ عالم جھک گئے۔ دفعتاً دیکھا کہ وہ تیر امام کے بدن میں پیوست ہوگیا ہے۔ خواب کے عالم میں ہی کہا۔ استغفراللہ ربی واتوب الیہ میں نے عجیب برا کیا ہے اب کی دفعہ ایسا نہیں کروں گا۔ دوسری مرتبہ تیر آیا تو دوبارہ جھک گئے۔ کئی بار ایسا ہی ہوا۔ اس عالم نے دیکھا کہ ہر موقع پر وہ بے ساختہ جھک جاتا ہے۔ اس وقت امام حسین نے اس سے فرمایا: انی لا اعلم اصحابا خیرا ولا افضل من اصحابی میں اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب کہیں نہیں پاتا۔ یعنی کیا تونے یہ سمجھا ہے کہ جو شخص کتاب پڑھ لے وہ مجاہد بن جاتا ہے؟! یہ ھقیقت ہے کہ من لم یغزولم یحدث نفسہ یغزومات شعبۃ من النفاق جس نے عملی طورپر جہاد میں حصہ نہ لیا ہو یا کم از کم مجاہد بننے کے بارے میں سوچا ہی نہ ہو تو اس کی روح میں دورنگی پائی جاتی ہے یعنی جہاد کے موقع پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

مولانا روم کی مثنوی میں ایک داستان آتی ہے جو اس واقعہ پر عمدہ طور پر منطبق ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک زاہدوعابد مرد تمام واجبات اورمستحبات کو بجالاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ذہن میں آیا کہ میں نے جہاد کے علاوہ ثواب والے تمام کام انجام دئیے ہیں۔ نمازیں بہت پڑھی ہیں، روزے بہت رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج بھی کیا ہے، مگر جہاد نہیں کیا۔ اس زمانہ میں صلیبی جنگیں ہورہی تھیں۔ اس نے مجاہدین سے کہا کہ اگر کبھی جہاد کا موقع آئے تو مجھے بتا دینا تاکہ میں یہ ثواب بھی حاصل کرلوں۔ انہوں نے کہا بہت خوب ہم تمہیں بتادیں گے۔

ایک دن وہ لوگ اس زاہد کے پاس، جس نے عمربھر لڑائی نہیں دیکھی تھی آئے اورکہا کہ جناب زاہد صاحب جہاد کے لیے چلیں۔ اس کے لیے ایک گھوڑا بھی مہیا کیا اور چل پڑے۔ ایک دن وہ خیمہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً نفیری کی آواز گونجی اورحملہ شروع ہوگیا۔ جو مجاہد تھے اورلڑائی میں حصہ لے چکے تھے پرندوں کی طرح اڑتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہوکر جہاد کے لیے روانہ ہوگئے۔

اس زاہد نے اٹھ کر لباس پہننے، تیروکمان لٹکانے، تلوار اٹھانے اورگھوڑا تیار کرنے میں ایک دو گھنٹے صرف کردئیے۔ اتنے میں وہ مجاہد واپس لوٹ آئے۔ اس نے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہم گئے تو دشمن فلاں حالت میں تھا، فلاں مقام سے انہوں نے حملہ کیا، ہم نے انہیں مارا قتل کیا، یہ سب کچھ کیا اورواپس لوٹ آئے۔ زاہد نے کہا کہ عجیب واقعہ ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ انہوں نے کہا کہ تم اپنی جگہ سے ہلے ہی نہیں۔ اس نےکہا کہ ہم تو اس ثواب و فیض سے محروم رہ گئے۔ ایک مجاہد نے کہا: ’’ہم ایک بہت ہی شریر دشمن کو قید کرکے ساتھ لائے ہیں۔ یہ شخص بہت سے مسلمانوں کو قتل کرچکا ہے، اس وقت وہ ایک خیمہ میں ہے۔ ہم نے اس کے بازو باندھ دئیے ہیں۔ اس کی گردن اڑا دینی چاہیے وہ بہت ہی شریر ہے۔ اب اس لیے کہ تم بھی ثواب حاصل کرسکو جائو اوراس کی گردن اڑا دو۔‘‘ زاہد روانہ ہوا جیسے ہی آگے بڑھا قیدی جو بدمعاش ہی تو تھا، اس نے گھور کر اس زاہد کو دیکھا اورللکارتے ہوئے پوچھا: ’’کیوں آئے ہو؟‘‘ یہ سنتے ہی زاہد بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ قیدی جس کے شانے بندھے ہوئے تھے، اس کے باوجود آگے بڑھ کر اس کی چھاتی پر چڑھ گیا اور اپنے دانتوں سے اس کا گلا کاٹنے لگا تاکہ آہستہ آہستہ اس کی شہ رگ کاٹ ڈالے۔ مجاہدین نے دیکھا کہ زاہد نے تاخیر کردی ہے۔ کہنے لگے کہ کہیں زاہد کو کوئی سانحہ پیش نہ آگیا ہو۔ جب گئے تو دیکھا کہ زاہد بے ہوش پڑا ہے اور کافر کے دانت اس کی شہ رگ کے قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ انہو ں نے کافر کو پیچھے ہٹا کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد زاہد کے منہ پر پانی چھڑکا اور اسے ہوش

میں لائے۔ پوچھا ’’کیا ہوا تھا؟‘‘ بخدا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جونہی میں اس کے قریب گیا اس نے مجھے گھور کر دیکھا اورللکارا۔ اس کے بعد میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔‘‘ یہ ہیں اس حدیث کے معنی من لم یغزولم یحدث نفسہ بغزومات علی شعبۃ من النفاق حقیقت یہ ہے کہ اپنی کھوکھلی و ناچیز عبادتوں کو صرف جسمانی اعتبار سے بجالاتے ہیں ہماری یہ عبادتیں، یہ نمازیں، یہ قرآن کی تلاوتیں، یہ ذکر روح عبادت سے خالی ہوتے ہیں اس لیے ظاہری شکل میں قابل قدر نہیں ہوتے جس سے یہ عموماً اپنے اندر غرور پیدا کرتے ہیں اورنتیجتاً ہم اپنے آپ کو دنیابھر سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسا مسلمان حقیقی مسلمان نہیں ہوتا۔ اس لیے پیغمبراکرم نے فرمایا ہے کہ اگر یہ مسلمان مرجائے تو اس کے باطن میں ایک قسم کی منافقت و دورنگی ہوگی لہٰذا قرآن فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ۰ۭ (انفال:۶۵) اے رسول مومنین کو جہاد کے واسطے آمادہ کرو ہمیشہ ان کو جہاد کی رغبت دلائو۔ انہیں ایسا بنائو کہ ان کی روح میں ہمیشہ جذبہ جہاد بیدار رہے، یہ تیار رہیں اورجہاد کو فراموش نہ کربیٹھیں۔ صلح و سلامتی کے عہد میں بھی ذہنی طور پر مجاہد ہوں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْــرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَـتَيْنِ۰ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَۃٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّہُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَہُوْنَ (انفال:۶۵) (گھبرائیں نہیں، اللہ ان سے وعدہ کرتا ہے کہ) اگر تم لوگوں میں ثابت قدم رہنے والے نہیں بھی ہوں گے تو دوسو (کافروں) پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر تم لوگوں میں سے (ایسے) سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے اس سبب سے کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔ آپ مومنین کو جنگ پر آمادہ کیجیے۔ اگر مومنین اپنی ایمانی بصیرت اورمعنوی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاد کی تربیت بھی حاصل کرلیں تو ان کا ایک فرد دشمن کے دس افراد کے برابر ہوگا۔ ان کے بیس افراد دشمن کے دوسو افراد کے اوران کے سو افراد دشمن کے ایک ہزار افراد کے مساوی ہوں گے۔ آخر ایسا کیوں ہوگا؟ کیا ان کی قوم ان سے مختلف ہے؟ قوم تو مختلف نہیں ہے۔ کیا مومنین کا زور بازو کفار کے زور بازو سے بہتر ہے؟ قرآن مجید یہ ہرگز کہنا نہیں چاہتا کہ مدینہ میں بسنے والے مسلمانوں کی قوت مکہ میں رہنے والے کفار کے زوربازو سے زیادہ ہے۔ ان کی اکثریت انصار یعنی او س و خزرج کے قبائل پر مشتمل تھی جبکہ قریش اوس و خزرج سے زیادہ شجاع تھے، ان سے کمزور ہرگز نہیں تھے۔ مہاجرین میں بھی اکثریت قریش ہی کی تھی جو کفار کے ہم قوم تھے۔ اس کے باوجود قرآن مجید فرماتا ہے کہ مومن اگر سرفروش و مجاہد بن جائے، بالفاظ دیگر اگر مجاہد بصیرت ایمان حاصل کرلے تو وہ دس کافروں کے برابر ہوجاتا ہے۔ اِنْ يَّكُنْ

مِّنْكُمْ عِشْــرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَـتَيْنِ۰۝۶۵ اگر ان مومنین میں دس افراد ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں تو وہ کفار کے دو سوافراد پر غالب آئیں گے یعنی ایک مومن دس کافروں پر غالب آئے گا۔ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَۃٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اسی طرح اگر تم میں ایک سو افراد ایسے ہوں تو وہ کفار کے ایک ہزار افراد پر بھاری ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار مجاہدین پرمشتمل تمہارا لشکر کفار کی ایک لاکھ فوج پر فتح پاسکتا ہے۔ یہ کس بنا پر ہے۔ صرف بصیرت ایمانی کی بنا پر۔ اب یہاں اس کے برعکس فرما رہا ہے اس لیے کہ ان میں بصیرت ایمانی نہیں ہے۔ یہ یعنی مومنین بصیرت ایمانی نہیں ہے۔ یہ یعنی مومنین بصیرت ایمانی سے سرشار ہیں۔ پس یہ بصیرت کی فتح ہے۔ بِاَنَّہُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَہُوْنَ کفار ناسمجھ اوربے بصیرت لوگ ہیں جبکہ ان کے برعکس مومنین دانا و بابصیرت ہیں۔

اس آیت کے بعد ایک اور آیت ہے جو بظاہر اس کو منسوخ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر یہ منسوخ نہیں ہوئی۔ اَلْــٰٔـنَ خَفَّفَ اللہُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا۰۝۶۶ فَاِنْ (اب اللہ نے اپنے حکم کی سختی میں) تخفیف فرمادی اور دیکھ لیا کہ تم میں یقیناً کمزوری ہے۔ اگر تم میں ثابت قدم رہنے والے ایک سو افراد ہوں تو وہ کفار کے دوسو افراد پر غالب آجائیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں آیات مبارکہ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ پہلے فرما رہا ہے کہ تمہارے بیس افراد ان کے دوسوافراد پر غالب رہیں گے اورپھر فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے کہ تمہارا ایک آدمی ان کے صرف دو آدمیوں پر بھاری ہوگا۔ ان آیات کا تعلق ایک ہی موقع سے ہے یا دو مختلف موارد سے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا تعلق دوزمانوں سے ہے، یعنی پہلی آیت کا ایک زمانہ سے تعلق ہے اور دوسری آیت کا دوسرے زمانہ سے۔ پہلی آیت کا مصداق صدراسلام اورجنگ بدر ہے جبکہ دوسری آیت سے آخری زمانہ کی جنگیں مثلاً جنگ حنین مراد ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایمان دس گنا قوت پیدا کرتا ہے تو یہاں دوگنا کیوں رہ گیا؟ کیا اب مسلمانوں کا ایمان کمزور ہوگیا تھا؟ پہلے ان کا ایمان قوی تھا جو تدریجاً کمزور ہوتا گیا؟ ایسا نہیں ہے۔ یا نعوذ باللہ یہ کہنا کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شبہ ہوگیا کہ پہلے تو اس نے کہا کہ تمہارا ایک فرد ان کے دس افراد کے برابر ہے۔ اور بعد میں فرمایا کہ نہیں تمہارا ایک فرد ان کے دو افراد کے برابر ہے یہ بھی ناممکن ہے اور یہ قرآن کی اپنی تعلیمات کے منافی ہے کہ اللہ جو ہر چیز کا جاننے والا ہے، غیب و شہود کا عالم ہے، ماضی و حال سے باخبر ہے۔ پھر بھی اشتباہ میں مبتلا ہو جائے

پس پھر اس کی حقیقت کیا ہے؟ امرواقعہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ ماضی میں تمہارا ہر فرد کفار کے دس افراد کے برابر تھا اور اب صرف دو کافروں کے برابر ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری یہ جماعت ماضی میں کافروں کی دس گنا بڑی جماعت کے مقابل تھی اور اب تمہاری تعداد کفار کی اس سے دوگنا بڑی جمعیت کے برابر ہے کہ اب تم کمزور ہوگئے ہو۔ یہ نہیں کہ وہ لوگ اب کمزور ہوگئے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں، مثلاً جنگ بدر کے موقع پر مسلمان برگزیدہ افراد سے عبارت تھے، وہ قرآن کے بقول قوم یفقھون تھے تھے پھر تدریجاً خصوصاً فتح مکہ کے بعد لوگوں کے گروہوں کے گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے جس میں مولفۃ قلوبھم بھی، حتیٰ کہ ضعیف الایمان بھی تھے۔ اب مسلمانوں میں ایسے افراد شامل ہوچکے تھے جن کا ایک فرد ان کے فقط ایک فرد یا اس سے بھی کمتر کے برابر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مومنین کے درمیان ایسے برگزیدہ مسلمانوں کی تعداد جن کا ایک فرد کفار کے دس افراد پر غالب آتا تھا، بہت کم رہ گئی اورمجموعی طور پر مسلمانوں کا لشکر فقط اپنے سے دگنے لشکر پر ہی فتح پاسکتا تھا، دس گنا لشکر پر نہیں۔ یہ جو میں عرض کررہا ہوں اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی نظر جماعت پر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں یہ فرماتا ہے کہ تمہارا ایک فرد ان کے دس افراد کے برابر ہے وہاں بھی قرآن مجید کی مراد یہ نہیں کہ تمہارا ہر فرد کفار کے دس افراد کے برابر ہے۔ یقیناً مسلمانوں میں ایسے افراد موجود تھے جو دس افراد کے ہم پلہ نہیں تھے۔ اس کے برعکس حضرت علی جیسے افراد بھی تھے جو پچاس افراد پر بھی بھاری تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شروع میں مسلمانوں کی جماعت اپنے سے دس گنا بڑے دشمن پر بھی فتح پاسکتی تھی لیکن بعد میں جب اسلامی تربیت پانے والے افراد اقلیت میں رہ گئے لوگوں کے گروہوں کے گروہ مسلمان ہونے لگے، ابھی ان کا ایمان قوی نہیں ہوتا تھا کہ یہ لشکر اسلام میں شامل ہوجاتے تھے۔ اس وقت یہ اپنے سے صرف دوگنا دشمن پر ہی فتح پاسکتے تھے۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ ماضی میں تم ایسے تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ نے جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری واقع ہوگئی ہے (اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے یہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ کا کسی امر کو جاننا اس کے ہونے کے برابر اور ہونا اللہ تعالیٰ کے جاننے کے برابر ہے) یعنی اب تمہاری یہ حالت ہوچکی ہے کہ تم کمزور ہوگئے ہو۔ اس کی مزید تفسیر انشاء اللہ آئندہ ہفتہ عرض کروں گا۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

تیرھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَہَاجَرُوْا وَجٰہَدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ وَاَنْفُسِہِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللہِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَــصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ بَعْضُہُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ۝۰ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُہَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِہِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰي يُہَاجِرُوْا۝۰ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰي قَوْمٍؚبَيْنَكُمْ وَبَيْنَہُمْ مِّيْثَاقٌ۝۰ۭ وَاللہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۷۲؀ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُہُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ۝۰ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَكُنْ فِتْنَۃٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۷۳؀ (انفال:۷۲۔۷۳)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اوراپنے اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اورجن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور (ہرطرح) ان کی خیرگری کی، یہی لوگ ایک دوسرے کے (باہم) سرپرست و دوست ہیں اورجن لوگوں نے ایمان تو قبول کیا اور ہجرت نہیں کی تو تم لوگوں کو ان کی سرپرستی سے سروکار نہیں۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت اختیار کریں اور(ہاں مگر) دینی امر میں تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو تم پر (ان کی) مدد کرنا لازمی و واجب ہے۔ مگر ان لوگوں کے مقابلہ میں نہیں جن میں اورتم میں باہم (صلح کا) عہدوپیمان ہے۔ اورجو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ دیکھ رہا ہے اورجو لوگ کافر ہیں وہ بھی (باہم) ایک دوسرے کے سرپرست ہیں۔ اگر تم (اس طرح) مدد نہ کرو گے تو روئے زمین پر فتنہ برپا ہوجائے گا اوربڑا فساد ہوگا۔

قرابت مثبت و منفی

سورہ مبارکہ انفال کے آخر میں چار آیتیں ہیں جو مسلمانوں کی باہمی قرابت اور مسلمانوں اورکفار کے درمیان عدم قربت سے متعلق ہیں۔ یقیناً آپ کسی حد تک اس بات سے باخبر ہوں گے کہ دین مقدس اسلام میں، جو ایک معاشرتی دین ہے، ایک چیز پر بہت تاکیدواصرار کیا گیا ہے اور وہ ہے مومنین میں باہمی اخوت۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اورمومنین کو کفار کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اتفاق سے کچھ عرصہ قبل ولاء ھاو ولا یتھا کے نام سے شائع ہونے والے اپنے ایک مقالہ میں

میں نے کسی حد تک اس بات کی وضاحت کی ہے۔ اب ہم ان آیات مبارکہ کی مناسبت سے اس موضوع کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

لفظ ولاء جس سے ’’ولایت‘‘ تولیٰ جیسے ہم غلط طور پر تولیٰ، بولتے ہیں ’’ولی‘‘ ’مولی‘‘ جیسے الفا ظ مشتق ہیں ، کہ معنی ملاپ و قرب کے ہیں۔ جب دو چیزیں یا دو اشخاص اس قدر ایک دوسرے کے قریب ہوں کہ ان کے درمیان فاصلہ باقی نہ رہے تو عرب اس کو ’’توالی‘‘ کہتے ہیں۔ ہم فارسی زبان میں بھی ’’توالی‘‘ کا لفظ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں دو چیزیں فاصلے کے بغیر ساتھ ساتھ ہوں، یعنی ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی ’’ولایت‘‘ ہونی چاہیے، یا انہیں ایک دوسرے سے ’’ولا‘‘ رکھنی چاہیے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ ان کے اجسام ایک دوسرے کے قریب ہوں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے ذہنوں اور تخیل میں قربت ہونی چاہیے، ان میں گہرے معاشرتی تعلقات ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کا دوسرے کی مدد کرنا اور اس کی دستگیری کرنا بجائے خود ایک رابطہ ، ایک قربت، ایک تعلق اورایک طرح کی ولایت کہلاتا ہے، جسے قرآن میں ’’ولاء‘‘ کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ایک دوسرے سے ’’ولا کرو‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے درمیان پختہ تعاون ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس مطلب کی تہہ تک پہنچنا اوراس کے مختلف مظاہر میں اس کا جائزہ لینا چاہیں تو یہ وہی بات ہے جس کو نبی اکرمؐ نے ایک بہت ہی عمدہ تشبیہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے: مثل المومنین فی تواددھم و تراممھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سایر الجسد بالسھر والحمی یعنی اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی مثال ہے۔ مومنین ایک پیکر کے اعضا کی مانند ہیں۔ جب کوئی عضو درد میں مبتلا ہوتا ہے تو تمام اعضا پریشان و بیدار رہ کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب بھی مسلمان ایسے ہوجائیں کہ ایک پیکر کے اعضا شمار کیے جانے لگیں، یعنی ان کے آپس کے تعلقات، ان کا باہمی میل جول، ایک دوسرے کے حالات میں ان کی شرکت، باہمی ہمدردی، تعاون و یگانگت اس سطح پر پہنچ جائیں کہ ایک پیکر کے اعضا شمار ہونے لگیں تو اس وقت مومنین اورمسلمین کی باہمی ولا کے متعلق قرآن کریم کا مقصد حاصل ہوجائے گا۔ اس مقالہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ ولا کی دو قسمیں ہیں مثبت اورمنفی۔ قرآن ایک مقام پر فرما رہا ہے کہ تم میں باہم ولا (الفت) ہونی چاہیے جبکہ دوسرے مقام پر کہہ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو ہدایت کررہا ہے کہ ان میں آپس میں ایک دوسرے سے ولا (الفت) ہونی چاہیے، کفار سے الفت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ایک پیکر بن کر رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے پیکر کا عضو بن جائو جو کسی دوسرے

کا ہو چاہے تم اس پیکر میں فانی ہو جائو یا تم اوروہ مل کر ایک پیکر کو تشکیل دیں یہ ان امور میں سے ہے جن کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

مسلمانوں کی چار جماعتوں میں قرآنی تقسیم

یہ چار آیات اس سلسلہ میں اپنے اندر ایک نہایت ہی پرمغز بیان لیے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم مسلمانوں کو چار جماعتوں میں تقسیم کرر ہا ہے اوران چاروں کے بارے میں حکم بھی لگا رہا ہے۔ یہ چاروں جماعتیں صدراسلام میں موجود تھیں، بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس تقسیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے پانچویں جماعت کفار کی ہے جن کے بارے میں قرآن مجید نے اشارہ فرمایا ہے۔ اب ہم ان چاروں جماعتوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں تاکہ انہیں اچھی طرح پہچان لیا جائے:

مہاجرین اولین یا سابقین اولین

صدراسلام کے مسلمانوں کی ایک جماعت مہاجرین اولین کی ہے جس کو قرآن کریم سابقون الاولون کا نام دیتا ہے۔ مہاجرین اولین سے مراد وہ حضرات ہیں جو نبی اکرم کی ہجرت مدینہ سے قبل مسلمان ہوچکے تھے۔ جب یہ طے پاگیا کہ پیغمبراکرم اپنے گھر اورشہر مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے جائیں تو یہ لوگ بھی اپنی ازواج، کاروبار، مال و دولت اور عزیزواقارب غرضیکہ سب کو چھوڑ کر اپنے عقیدہ و ایمان کے ساتھ نکل پڑے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ فرض کریں ہمارے ساتھ بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ ایمان کی حفاظت کے لیے ہم اقدام کرنا چاہیں تو کیا اپنے آپ، اپنا کاروبار، ملازمت ، بیوی بچوں غرض جو کچھ بھی ہماری ملکیت ہے، ان سب کو ایسی صورت میں سامنے رکھیں، نیز فرض کریں کہ یکایک ہمارا دینی و ایمانی لیڈر حکم صادر کردیتا ہے کہ ہم سب کو اکٹھے یہاں سے کسی دوسرے ملک یا دوسرے شہر میں منتقل ہوکر اسے اپنا مرکز بنانا ہے تو ہم ایک دم اپنا کاروبار، بیوی بچوں، والدین بہن بھائیوں، الغرض اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑیں؟ اگر ایسا ہو تو اس سے ہمارے انتہائی خلوص اوربلندترین درجہ ایمان کی نشاندہی ہوگی۔ قرآن مجید ان کو مہاجرین اولین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ لیکن اس آیت میں مہاجرین اولین کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ قرآن کی ایک اور آیت میں السابقون الاولون (توبہ :۱۰۰) کے الفاظ آئے ہیں۔

انصار

دوسری جماعت جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو قرآن ’’انصار‘‘ کے نام سے یاد فرماتا ہے۔ انصار کے معنی نصرت یا امداد کرنے والوں کے ہیں۔ ان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مدینہ کے باشندے تھے، مدینہ ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، اپنے شہر کو اسلام کا مرکز بنانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا مکہ اور دوسرے مقامات، زیادہ تر مکہ سے آنے والے اپنے نادار و تہی دست بھائیوں کو نہ صرف اپنے گھروں میں جگہ دی، انہیں اپنا مہمان جانا بلکہ ان کے جان و مال اورحیثیت کا اسی طرح دفاع کیا جس طرح وہ اپنے جان و مال و حیثیت کا دفاع کرتے تھے۔ ان کے بارے میں تاریخ میں آتا ہے کہ انہوں نے ناموس کے علاوہ باقی ہر چیز میں مسلمان بھائیوں کو اپنے ساتھ شریک کیا، بلکہ مسلمان مہاجر بھائیوں کو خود اپنے آپ پر ترجیح دی۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۰ۭ (حشر:۹) (اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی (کیوں نہ) ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں) صدراسلام کے مسلمانوں کی یہ عظیم ہجرت بہت اہمیت رکھتی تھی، تاہم اگر انصار ان کا ساتھ نہ دیتے تو وہ کچھ بھی نہ کرسکتے۔ ان کو بھی قرآن کریم کے وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَــصَرُوْٓاالفاظ سے یاد فرماتا ہے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ انہوں نے اس وقت ہجرت کی جب اسلام پر مصائب کا دورتھا اورانہوں نے بھی اس نازک موقع پر مہاجرین کی استعانت کی، غرضیکہ مہاجرین میں بلا کا خلوص تھا اورانصار میں بھی ویسا ہی فداکاری کا جذبہ تھا۔

غیرمہاجرمومنین

تیسرا گروہ ان مسلمانوں کا ہے جو مکہ ہی میں تھے۔ یہ مسلمان تو تھے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ یہ مکہ یعنی شہر کفر ہی میں رہے۔ (اس وقت مکہ شہر کفر تھا) حقیقت میں ان میں اپنے ہجرت کرنے والے مسلمان بھائیوں جیسی ہمت نہ تھی۔ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں ان کے مسلمان بھائی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرگئے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ بیٹا مدینہ میں آکر مسلمانوں سے جا ملتا ہے جبکہ باپ مکہ میں کفار میں شامل ہے، پھر جب جنگ ہوتی ہے تو باپ بیٹا ایک دوسرے پر تلوار سے حملہ آور ہوتے ہیں، بھائی بھائی پر تلوار کے وار کرتا ہے، قریبی رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے پر تلوار اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ لوگ مدینہ نہ آئے، شہر کفر میں ٹھہرے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنا ایمان محفوظ رکھا یعنی مسلمان ہی رہے مگر ہجرت نہ کی۔ انہوں نے عظیم فریضہ ہجرت انجام نہ دیا۔

مہاجرین آخرین

چوتھی جماعت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہجرت تو کی مگر مصیبت کے ایام کی بجائے صلح حدیبیہ کے بعد۔ امن و امان کے ان دنوں میں جب ہجرت کرنا آسان تھا اورہجرت کو قانونی حیثیت مل چکی تھی۔ واقعہ حدیبیہ کے وقت، جو بذات خود ایک اہم اور مفصل واقعہ ہے، پیغمبراکرم نے ابھی مکہ کو فتح نہیں کیا تھا۔

آنحضرتذوالقعدہ اورذوالحجہ کے مہینوں میں حج بجالانے کے ارادہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ حجاج کرام احرام باندھے ہوئے، قربانی کے جانور ساتھ لیے ہوئے خانہ کعبہ کی زیارت کرنے اور حج بجالانے کی غرض سے مکہ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق مکہ والوں کو حرمت کے مہینوں میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے آنے والوں کو زیارت خانہ خدا کی اجازت دینا چاہیے تھی چاہے وہ ان کے دشمن ہی کیوں نہ ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سدراہ ہوئے۔ انہوں نے مکہ سے باہر یہ کہہ کر اپنا ایک لشکر بھیجا کہ ہم محمدکاراستہ روکیں گے اور انہیں آنے نہیں دیں گے۔ پیغمبراکرم بھی اپنی جگہ مکہ میں خون ریزی پر راضی نہیں تھے۔ لہٰذا آپ نے ان سے صلح کا ایک معاہدہ طے فرمایا۔ شروع میں مسلمان اس معاہدہ کے اثرات سے واقف نہ تھے مگر بعد میں انہوں نے دیکھا کہ اس کے بہت اچھے اثرات برآمد ہوئے۔ اس معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ وہ مسلمان جو اس وقت مکہ میں زندگی بسر کررہے ہیں انہیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس شرط نے کام آسان کردیا۔ یعنی مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ مذہبی آزادی دلا دی۔ لہٰذا صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کرنا کوئی مشکل کام نہ رہا۔

یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مہاجرین اولین کی صف میں نہیں آتے بلکہ یہ مہاجرین آخرین تھے۔ قرآن مجید ان چاروں جماعتوں کا ذکر فرماتے ہوئے مہاجرین اولین اور انصار کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہے۔ اور انہیں حقیقی مومنین کا نام دیتا ہے۔ مگر وہ مومنین جو مکہ میں ہی رہ گئے تھے وہ ان کے برابر قرار نہیں پاتے۔ ارشاد فرماتا ہے کہ تمہیں وہ ولایت جو دوسروں کے لیے ہے، حاصل نہیں ہے کیونکہ اگرچہ تم کفر کے شہر میں ٹھہرے رہے ان اجتماعی حقوق سےکسی حد تک محروم ہو جس کے مہاجرین اولین حقدار ہیں۔ یہ واقعی ان مہاجرین کی مانند نہیں تھے جنہوں نے پہلے ہجرت کی تھی بلکہ ان سے کسی قدر مختلف تھے۔ قرآن فتح مکہ سے قبل (بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد) اسلام لانے والے مسلمانوں اور فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخ لہونے والے مسلمانوں کو بالخصوص یکساں

قرار نہیں دیتا اوران میں فرق کا قائل ہے بلکہ صراحت کے ساتھ فرماتا ہے: لَایَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ۰ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا۰ۭ (حدید:۱۰) تم میں جس نے فتح (مکہ) کے پہلے (اپنا مال) خرچ کیا اورجہاد کیا (اورجس نے بعد میں) وہ برابر نہیں ۔ ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اورجہاد کیا ۔

یعنی جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل اپنا مال راہ خدا میں خرچ کیا اورجہاد کیا، ان کو ان لوگوں جیسا نہیں قرار دیا جاسکتا جنہوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام انجام دئیے کیونکہ فتح مکہ سے قبل مسلمان اقلیت میں تھے، عربوں کو اس وقت تک یقین نہ تھا کہ اسلام فتح یاب ہوگا ۔ مگر فتح مکہ کے بعد جب کفار نے دیکھا کہ جس مکہ کو ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں کے ساتھ تباہ کرنے کے لیے آیا مگر اس کا کوئی نقصان نہ کرسکا اور اللہ نے ابرہہ کو مکہ سے دور ہٹا دیا، وہی مکہ مسلمانوں کے ہاتھوں بڑی آسانی سے فتح ہوگیا ہے تو انہیں یقین ہوگیا کہ ایک معنوی طاقت کا اس میں ہاتھ ہے۔ بہرحال قرآن کریم نے ان چاروں جماعتوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔

کفار

رہا کفار کا مسئلہ تو آپ ان کی آپس کی الفت و قرابت کی پروا نہ کریں۔ آپ کا کفار سے الفت سے کیا واسطہ آپ ان کی جماعت کا کسی طرح حصہ نہیں بن سکتے بلکہ آپ ایک الگ اکائی رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے جس قدر مسلمانوں کی ایک جداگانہ اکائی اور الگ پیکر ہونے کی تاکید فرمائی ہے بہت کم باتوں کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔ اسی مقام پر یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَكُنْ فِتْنَۃٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (آیہ عنوان) اے مسلمانو! اگر تم میری نصیحت پر کار بند نہ ہوگے تو زمین پر بہت بڑا فتنہ و فساد کھڑا ہوجائے گا، یعنی پھر اسلام مٹ جائے گا۔

اب میں درجہ بدرجہ ان آیات مبارکہ کے معنی کسی قدر وضاحت سے بیان کروں گا۔ قرآن مجید شروع میں ہی پہلی دو جماعتوں یعنی مہاجرین وانصار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یقیناً جو لوگ ایمان لائے یہ نہیں فرماتا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، پیغمبراکرمؐ پر ایمان، قیامت و روزجزا پر ایمان، غیبی امور، وحی فرشتوں پر ایمان، غرض جو لوگ ان سب چیزوں پر ایمان لائے ہیں وَہَاجَرُوْا اور اپنے ایمان اور عقیدہ پر قائم رہتے

ہوئے انہوں نے ہجرت کی یعنی اپنے ایمان و عقیدے کی خاطر مکہ کو چھوڑ گئے۔

مسئلہ ہجرت

علما کے درمیان ایک مسئلہ زیربحث بنا ہوا ہے جو یہ ہے کہ قرآن کریم ہجرت کے لیے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہجرت پیغمبراکرم کے زمانہ کے ساتھ ہی مختص ہے یا دوسرے زمانوں میں بھی ضروری ہے!

امیرالمومنین علی فرماتے ہیں الھجرۃ قائمۃ علی حدھا الاول ہجرت کا اصول روز اول کی طرح اب بھی برقرار ہے۔ یعنی اسلام کسی مسلمان کو بھی مسلمان ہوتے ہوئے یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ بلاوجہ کافروں کے ملک میں جابسے اورکہے کہ مجھے وہاں زندگی بسر کرنا اچھا لگتا ہے۔ مثلاً ایک ایرانی جو خود مسلمان ہے اور اس کے خاندان کے تمام افراد بھی مسلمان ہیں چند سال تعلیم پانے کے بعد امریکہ کی کسی ریاست میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کسی وقت اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے یہ جگہ بہتر ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں ہی زندگی بسر کروں یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ خوش گوار زندگی گزارنا چاہتا ہے یعنی وہ اسلامی معاشرہ سے خود کو مکمل طور پر الگ کرکے غیراسلامی معاشرہ کا رکن بن جاتا ہے۔ کیا اس شخص کے لیے ہجرت کا لفظ نامناسب ہے یا نہیں؟ کیا ان حالات میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ کسی ایسے مقام پر آکر زندگی بسر کرے جہاں وہ اسلامی معاشرہ کا رکن قرار پائے یا ایسا ضروری نہیں؟ یقیناً لازم ہے کیونکہ الھجرۃ قائمۃ علی حدھا الاول ہجرت کا اصول پہلے ہی کی طرح اب بھی برقرار ہے۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان کسی خاص کام کی انجام دہی یا اپنے فرائض بجالانے کی خاطر کافروں کے ملک میں جاتا ہے تو مسئلہ الگ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی انسان کو اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے لیے کئی سال تک کفار کے ملک میں رہنا پڑے مگر وہ اس معاشرہ کا اپنے آپ کو حصہ نہ بنائے بلکہ اپنے معاشرہ ہی کا رکن رہے، اپنے معاشرہ کی خاطر اور اپنا فرض بجالانے کے لیے اس ملک میں جائے تو یہ ایک اورصورت ہوگی۔ اگر وہ صرف اس وجہ سے کفار کے ملک میں جائے کہ اس ملک کو زیادہ پسند کرتا ہو تو اس کا جو سب سے پہلا نتیجہ نکلے گا وہ بالکل واضح ہوگا فرض کریں کہ یہ شخص خود پکا مسلمان وہاں نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، اسلامی احکام پر عمل کرتا ہے لیکن اس کے بچوں کا کیا حال ہوگا ، اس کے بچوں کے بچوں کی کیا صورت ہوگی؟ بہت بعید ہے کہ اس شخص کی نسل

بھی اسلام پر اسی طرح قائم رہے۔ پس یوں سمجھیں کہ اس نے درحقیقت گویا ایک مسلمان خاندان کو کفر کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔

ہجرت بصورت جماعت

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں یہ مسئلہ حالات کے تابع ہے۔ بعض اوقات ایک مسلمان خاندان ہجرت کرکے کفار کے کسی ملک میں جابستا ہے جہاں وہ ایک مرکز کو تشکیل دیتا ہے بالفاظ دیگر یہ خاندان اس بیج کی مانند ہوتا ہے جو تدریجاً نشوونما پاتا ہے۔ موجودہ اسلامی ممالک میں سے بہت سے ممالک اسی طرح کے مہاجرین اور بامقصد ہجرتوں کا نتیجہ ہیں، یعنی مسلمان خاندان بہتر زندگی بسر کرنے کی غرض سے ان ممالک میں جابسے، ضمناً ایک مرکز کو تشکیل دیا جس نے تدریجاً نشوونما پائی۔ میری ایک کتاب ''خدمات متقابل اسلام و ایران'' کے نام سے زیرطبع ہے۔ میں نے اسلام کے لیے ایرانی خدمات کے موضوع پر، جہاں تک میرے امکان میں تھا، مطالعہ کیا ہے۔ ایرانیوں نے اسلام کی جو بھی خدمات انجام دی ہیں ان کا تعلق محض تبلیغ کے ساتھ ہے، یعنی ایرانیوں نے دنیا میں اسلام کی تبلیغ و ترویج کا کام انجام دیا ہے۔ یہ تبلیغات زیادہ تر اسی صورت میں ہوئیں جس کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے۔ کئی ایرانی خاندان کسی دوسری جگہ جابسے، مگر چونکہ یہ پکے مومن اوراسلام پر پختہ، اعتقاد رکھتے تھے۔ اس لیے یہ نہ صرف دوسروں کے رنگ میں نہ رنگے گئے بلکہ انہوں نے دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مثلاً کیا آپ کو یقین آئے گا کہ انڈونیشیا میں جس کی آبادی ایک سو دس ملین ہے، اسلام خصوصاً ایرانیوں کی آمدورفت کا نتیجہ میں پھیلا ہے؟ گذشتہ سال اسفند (ایرانی سال کے آخری مہینے کا نام) کے مہینہ کے اواخر اور فروردین (ایرانی سال کے پہلے مہینے کا نام) کے مہینہ کے شروع میں ''ہزارہ شیخ طوسی'' کے نام سے جو کانفرنس مشہد میں بلائی گئی تھی اورمیں نے بھی اس میں شرکت کی تھی، اس میں انڈونیشیا کے ایک عالم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہماری آبادی ایک سو دس ملین ہے جس میں نوے فیصد لوگ، یعنی ننانوے ملین افراد مسلمان ہیں۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کس طرح مسلمان ہوئے! سب جانتے ہیں کہ وہاں لشکر کشی نہیں ہوئی۔ اسلام کو انڈونیشیا میں سات آٹھ صدیوں سے زیادہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا، اگرچہ اسلام وہاں پہلی صدی ہی میں قدم رکھ چکا تھا جب عرب مہاجرین وہاں پہنچے تھے۔ مگر اس ملک میں صحیح معنوں میں اسلام کا بیج ایران کے مسلمان مہاجرین ہی نے بویا تھا۔ اسی طرح اشتراکی ملک چین میں چالیس ملین عوام مسلمان ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں زندگی بسر کررہے ہیں، لیکن چالیس

ملین مسلمان موجود ضروری ہیں اوریہ لوگ زیادہ تر ایرانی مسلمانوں کی ہجرت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے ہیں۔

میں صرف اس بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد کسی جگہ یہ غرض لے کر جائے کہ وہاں اسلام کا بیج بونا ہے، یا بصورت دیگر مسلمان یونہی کسی جگہ جاکر سکونت اختیار کرلیں اورپھر اسی ملک کے عقائد کا حصہ بن جائیں، ان جیسے ہی ہوجائیں تو ان دونوں صورتوں میں بہت واضح فرق ہوگا۔ پس جہاں انسان کسی کافر معاشرہ کا رکن بننا چاہتا ہو، اسلام اس پر وہاں سے ہجرت کرجانے کو واجب و لازم قرار دیتا ہے۔

لہٰذا قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور وہ بلادکفر سے منتقل ہوکر اسلام کے مرکز میں آگئے وَجٰہَدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ وَاَنْفُسِہِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللہِ انہوں نے اپنے اموال اوراپنی جانوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا، مصیبتیں جھیلیں، قتال یعنی جنگ کرنے کے علاوہ بھی انہوں نے اللہ کے راستے میں اپنے اموال اورجانوں کے حوالے سے مشقتیں اٹھائیں، دولت خرچ کی، اپنے مال سے ہاتھ دھوئے، جانیں دیں، تکالیف اٹھائیں، تو یہ تھی ایک جماعت وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اورجنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی۔ انہیں اپنے گھروں میں بسایا وَّنَصَرُوْٓا نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ ان کی نصرت بھی کی اُولٰۗىِٕكَ بَعْضُہُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ۰۝۷۲ (یہ لوگ اسلامی معاشرہ کے مرکز کو تشکیل دیتے ہیں) تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے ’’ولی‘‘ ہیں۔ اس مقام پر ’’ولی‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپس میں مضبوط دلی تعلق رکھتے ہیں، ان میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ پس چونکہ یہ ایک دوسرے سے پختہ تعلق رکھتے ہیں لہٰذا انہیں آپس میں ایک دوسرے کی نصرت و تعاون کرنا ہی چاہیے۔ یہ ا ن کی مدد کریں اور وہ ان کی، حتیٰ کہ ان کے درمیان ’’ولایت امن‘‘ پائی جانے لگے، یعنی اگر ان میں سے کوئی ایک کسی کو پناہ دے گا تو گویا ان سب نے اسے پناہ دی۔

مسلمانوں کے درمیان رشتہ اخوت

یہاں ایک مسئلہ سامنے آتا ہے جس کا بیان کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ منتقل ہوئے، جیسا کہ آپ بارہا سن چکے ہیں، پیغمبراکرمؐ نے ان کے اور انصار کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرمایا، یعنی ہر مہاجر کو کسی انصار کا بھائی بنادیا یا کبھی وہ خود اپنے لیے بھائی کا انتخاب کرلیتے اورنبی اکرمؐ انہیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دے

دیتے۔ مواخات کا رواج اب بھی موجود ہے۔ یقیناً آپ نے دعائوں کی کتابوں مثلاً ’’مفاتیح الجنان‘‘ میں پڑھا ہوگا کہ مستحب ہے کہ ذی الحجہ کی اٹھارھویں تاریخ یعنی روز غدیر مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے صیغہ اخوت پڑھیں۔ اس کے بعد ان پر باہم مزید حقوق عائد ہوجاتے ہیں، مثلاً دونوں پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ دعا کے وقت دوسرے کو فراموش نہ کریں، قیامت کے دن ایک دوسرے کی شفاعت کریں، ان میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہوئے اس کے ساتھ بھلائی کرے وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا کہ صدراسلام میں پیغمبراکرم نے مہاجرین اورانصار کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرمایا حتیٰ کہ ابتدا میں انہیں ایک دوسرے کا وارث بھی بنایا، یعنی فرمایا کہ یہ ایک دوسرے کے ترکہ کے وارث ہوں گے، لیکن یہ حکم استثنائی تھا اورمقررہ عرصے تک کے لیے ہی تھا۔ اگر کوئی مہاجر انتقال کرتا اورترکہ میں کچھ چھوڑ جاتا تو وہ مال اس کے انصاری بھائی کو وراثت میں مل جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کا چھوڑا ہوا ترکہ اس کے مہاجر بھائی کو ملتا۔ پیغمبراکرم نے اس کا حکم ان ایام میں دیا تھا جب مسلمان پریشانی میں تھے۔ بعد میں اس حکم کو منسوخ کرکے فرمایا کہ میراث قرابت داری و رشتہ داری کی بنیاد پر ہی تقسیم کی جائے اور یہ حکم اب بھی اسی طرح باقی ہے۔ اس موقع پر نبی اکرم نے امیرالمومنین کو اپنا بھائی قرار دیا۔ اس واقعہ کو اہل سنت حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پیغمبراکرم نے تمام مہاجرین و انصار میں ایک کو دوسرے کا بھائی قرار دیا۔ اس قاعدہ کے مطابق پیغمبراکرم کو چاہیے تھا کہ حضرت علی کو جو مہاجر تھے، کسی انصاری کا بھائی بناتے۔ مگر آنحضرت نے کسی بھی انصاری کے ساتھ ان کا بھائی چارہ قائم نہ فرمایا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ امیرالمومنین حضرت علی نے پیغمبراکرم کے پاس آکر عرض کیا۔ ’’یارسول اللہ! میرا بھائی کہاں ہے جبکہ آپ نے ہر کسی کو کسی دوسرے کا بھائی بنایا ہے تو میرا بھائی کہاں ہے؟‘‘ فرمایا: انااخوک ’’میں تمہارا بھائی ہوں‘‘ یہ بات امیرالمومنین کے عظیم فضائل میں سے ایک ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ امیرالمومنین کو نبی اکرم کے اصحاب میں امتیازی حیثیت حاصل تھی لہٰذا انہیں دوسروں کا ہمسر اورہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل نبی اکرم کو بھی اصولاً مستثنیٰ ہونا چاہیے اور اگر فرض کریں کہ آنحضرت مستثنیٰ نہیں ہیں تو آنحضرت بھی تو ایک مہاجر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی انصار میں سے کسی کے ساتھ رشتہ اخوت قائم کرنا چاہیے تھا اور حضرت علی کا بھی کسی انصاری کے ساتھ ہی یہ رشتہ قائم کرنا لازم تھا۔ مگر آنحضرت نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود اپنے اور حضرت علی کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسی وجہ سے

رشتہ اخوت کا یہ شرف ہمیشہ کے لیے امیرالمومنین کے ساتھ مختص ہوگیا۔ امیرالمومنین خود بھی اپنے آپ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے اور دوسرے بھی انہیں اخو رسول اللہ ''پیغمبر اکرم کا بھائی'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ امیرالمومنین رشتے میں آنحضرت کے چچازاد بھائی لگتے تھے، مگر انہیں ''پیغمبراکرم کا بھائی'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آنحضرت نے مواخات قائم کرتے وقت فرمایا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہو، کچھ عرصہ تک وہ اس مواخات کے نتیجہ میں ایک دوسرے کا چھوڑا ہوا ترکہ بھی پاتے رہے، یہ تھا وہ خاص جماعتوں کا ذکر۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا وہ لوگ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی، ایسے لوگ بہت سے تھے جو اپنا مال و دولت، رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو نہ چھوڑ سکے تھے۔ مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا۰ یعنی وہ جب تک ہجرت نہ کریں اس وقت تک وہ اس ولایت میں تمہارے شریک نہیں ہیں۔ وہ مسلمان جو مکہ میں ٹھہرگئے ہیں، مکہ والوں ہی کا حصہ ہیں۔ وہ لوگ مسلمان تو ہیں لیکن مسلمانوں میں جس رشتہ و اخوت کا قریبی تعلق پایا جاتا ہے اس میں وہ شریک نہیں ہیں۔ قرآن مجید ان کو مستثنیٰ فرماتا اورکہتا ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہارے بھائی نہیں ہیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ کافروں کی مانند ہیں۔ اگر کسی وقت انہیں مدد کی ضرورت ہو، وہ تم سے مدد مانگیں اورتمہارے لیے مدد کرنا جائز ہو (ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اس قوم کے خلاف مدد مانگیں جو تمہارے ساتھ معاہدہ کرچکی ہو) تو اس صورت میں ان کی مدد کرو، مگر یہ اسی صورت میں ہے جب وہ تم سے خود مدد طلب کریں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ان تمام حقوق سے محروم ہیں جو دوسرے مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ابھی تک کفار کے علاقہ میں سکونت پذیر ہیں، یہ اسلامی معاشرہ کا حصہ نہیں بن سکتے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰي قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۰ لیکن اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو تمہیں ان کی مدد کرنا لازم ہے سوائے اس کے کہ وہ تم سے اس قوم کے خلاف مدد مانگیں جن کے ساتھ تم معاہدہ کرچکے ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں اس بارے میں بحث کی گئی تھی کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر تم مشرکوں کے ساتھ بھی صلح کا معاہدہ کرلو اوراگر کسی قرارداد پر دستخط کرچکو تو پھر اس کا احترام کرو، مگر یہ کہ وہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کریں یا ایسے واضح آثار دکھائی دیں کہ وہ اس کی خلاف ورزی کا ارادہ رکھتے ہیں، یعنی ان کی جانب سے معاہدہ کی خلاف ورزی کا

اندیشہ ہو، تاہم جب تک صرف اندیشہ ہی ہو اور انہوں نے عملی طوپر اس کی خلاف ورزی نہ کی ہو تو اس وقت تک انہیں بے خبری میں جا پکڑنے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ پھر بھی پہلے تمہیں ان کو بتانا ہوگا کہ اس وقت کے بعد ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْہِمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ۰ۭ ان کو آگاہ کردو کہ تمہارے ساتھ ہمارا معاہدہ ختم ہوگیا ہے لہٰذا ایک دوسرے کے برابر ہیں اب ہمارا آپس میں کوئی معاہدہ نہیں رہا۔

پس قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیتا ہے کہ اگر وہ مصلحت جانیں تو کفار کے ساتھ صلح یعنی ایک دوسرے کے امور میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں اورجب تک فریق ثانی اس معاہدہ کی شرائط کی خلاف ورزی نہ کرے یا ان کی جانب سے اس کے خلاف ورزی کے آثار نظر نہ آئیں تب تک مسلمان اس کا احترام کریں۔ لہٰذا یہاں فرماتا ہے کہ اگر کفار کے علاقہ میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان تم سے مدد مانگیں تو تم ان کی مدد کرو لیکن اگر وہ اس قوم کے خلاف تم سے مدد مانگیں جس کے ساتھ تم نے عدم مداخلت کا معاہدہ کیا ہوا ہے پھر اگر تم ان مسلمانوں کی مدد کرو اور یہ مدد اس معاہدے کی خلاف ورزی شمار ہوتی ہو تو اس صورت میں تم ان کی مدد مت کرو۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُہُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ۰ۭ رہا کفار کا مسئلہ تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قرابت رکھتے ہی ہیں بعض مفسرین خصوصاً علامہ طباطبائی تفسیرالمیزان میں فرماتے ہیں کہ قرآن یہاں کافروں کی ذمہ داری بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کفار تو اسلام کے پیروکار ہیں ہی نہیں۔ قرآن بتانا چاہتا ہے کہ کفار کے مابین عہدوپیمان اور اشتراک عمل کی ولایت پائی جاتی ہے۔ لیکن تم کسی طرح اس کا حصہ مت بنو۔ اس کے بعد قرآن مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَكُنْ فِتْنَۃٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ اگر تم کافروں کی محبت سے اپنا دامن بچا کر نہ رکھو گے تو زمین پر بہت بڑا فساد برپا ہوجائے گا۔

ہم مسلمان اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں اور متواتر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان آخر اس درجہ شکست خوردہ کیوں ہیں، اس حد تک حقیر کیوں ہیں؟ دراصل ہم یہ عقیدہ بنا چکے ہیں کہ فقط اذان و اقامت کہہ لینے اور نماز بجالانے سے ہی ہم حقیقی مسلمان بن چکے ہیں یعنی چونکہ ہم اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ کہتے ہیں، لہٰذا ہم حقیقی مسلمان ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی اسلام کے احکام ہیں۔ اسلام کے اہم احکامات میں سے ایک کا تعلق مسلمانوں کے خصوصی معاشرتی تعلقات سے ہے۔ قرآن بتلاتا ہے کہ اگر تم ان احکام پر عمل نہیں کرو گے تو تمہارے حالات خراب ہوجائیں گے۔ ہم مسلمانوں نے چونکہ اس پر عمل

نہیں کیا لہٰذا ہمارے حالات پریشان ہوگئے ہیں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے دشمن ہم پر اس قدر وار نہیں کررہے جس قدر ہم مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خلاف درپے آزار ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک قابل احترام شخص کو اس بات پر اظہارافسوس کرتے ہوئے دیکھا کہ فلاں شخص نے کہا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فلسطینی اسرائیلیوں کو قتل کریں یا اسرائیلی فلسطینیوں کو قتل کریں۔

حیرت ہے ایک طرف تو قرآن فرما رہا ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُہُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ۰ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَكُنْ فِتْنَۃٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ دوسری طرف ہم کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسرائیل کہ جو مسلمانوں کا الدالخصام یعنی بدترین شمن ہے یعنی اسرائیل سے بڑھ کر اورمسلمانوں کا کوئی خطرناک تر دشمن ہے ہی نہیں، فلسطینیوں کو قتل کرے یا فلسطینی اسرائیلیوں کو قتل کریں۔ اس کے باوجود ہم سعادت مند ملت بننے کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ میں نے یہ بات سنی تو ایک حدیث میرے ذہن میں آئی۔ یہ حدیث امام حسن عسکری کی تفسیر میں ہے اوربہت مشہورہے۔ کافی عرصے سے مجھے یہ حدیث یاد ہے۔ امام حسن عسکری جو ان لوگوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو علما شمار کرتے ہیں اورآخری زمانہ میں پیدا ہوں گے ارشاد فرماتے ہیں: ھم اضر علی ضعفاء شیعتنا من جیش یزید علی الحسین بن علی علیہ السلام واصحابہ یعنی ایسے لوگوں کے ہاتھوں امت مسلمہ کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا وہ اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو امام حسین ابن علی علیہما السلام نے لشکریزید کے ہاتھوں اٹھایا۔ یہ واقعی ایک حقیقت ہے جو شخص لوگوں میں اس نظریہ کی تبلیغ کرتا ہے اس کے ہاتھوں جو نقصان اسلام کو پہنچتا ہے وہ اس سے ہرگز کم نہیں جو یزیدی لشکر کے ہاتھوں امام حسین علیہ السلام کو پہنچا۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَہَاجَرُوْا وَجٰہَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللہِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ ہُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۰ۭ لَہُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ قرآن دوبارہ مہاجرین و انصار کی تکریم و تعظیم میں فرماتا ہے۔ وہ باایمان، وہ مہاجرین، وہ راہ خدا میں جہاد کرنے والے، نیز یہ انصار کہ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی، یہ حقیقی مومن ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جب انسان زاہد بن جائے اور اپنے ایمان و عقیدہ کی خاطر ہر طرف سے منہ موڑ لے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ حقیقی مومن ہے لَہُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ گناہوں کو بخش دیتا ہےا وران کو اچھی روزی عطا فرماتا ہے۔ یہاں روزی سے مراد صرف کھانے پینے کی اشیا نہیں۔ یعنی اللہ

تعالیٰ ان کو ایسی عظیم نعمتوں سے نوازتا ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَہَاجَرُوْا وَجٰہَدُوْا مَعَكُمْ یہاں تک کی ساری بحث مہاجرین اولین اور انصار سے متعلق تھی۔ وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر بعد میں ایمان لائے ان ایام مصائب میں ایمان نہ لائے نہ انہوں نے ہجرت کی اورنہ تمہارے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا فَاُولٰۗىِٕكَ مِنْكُمْ۰ۭ یہ بھی تم میں سے ہی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مرتبہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تمہارا مرتبہ ہے۔ البتہ یہ تم میں سے ہی ہیں۔ ان کو تم اپنے آپ سے الگ نہ جانو، یعنی یہ مہاجرین کی مانند ہی ہیں، یہ بھی اسلامی معاشرہ کا حصہ ہیں، اسی پیکر کا حصہ ہیں جو تمہارا ہے۔ اس کے باوجود ان کا وہ مقام نہیں ہے جو مہاجرین اولین اور انصار کا ہے۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُہُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللہِ۰ۭ اِنَّ اللہَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (انفال:۷۵) اور صاحبان قرابت اللہ کی کتاب میں باہم ایک دوسرے کے (بہ نسبت اوروں کے) زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ ان آیات مجیدہ میں مومنین کی باہمی قرابت کی بات کی گئی ہے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں۔ ان میں جو تعلق پایا جاتا ہے اس کو ہم اپنی اصطلاح میں روحانی و معنوی تعلق سے تعبیر کرتے ہیں، خصوصاً جب اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ تواریخ بتاتی ہیں کہ پیغمبراکرمؐ نے ان حضرات کو کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کے ترکہ کا وارث بھی قرار دیا تھا، تاہم اس لیے کہ مسلمان یہ خیال نہ کریں کہ نسبی تعلق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، معنوی تعلق ہی سب کچھ ہے، لہٰذا ترکہ فقط مسلمان بھائیوں ہی کو ملتا ہے، نسبی اورعقد کے نتیجے میں برقرار ہونے والی قرابت داری کی بنا پر نہیں ملتا قرآن فرماتا ہے کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُہُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللہِ۰ۭ رشتہ دار ایک دوسرے پر ترجیح رکھتے ہیں یعنی ترکہ کے مسئلے میں قرابت داری ہی فوقیت رکھتی ہے کوئی اور چیز نہیں۔ اِنَّ اللہَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یقیناً اللہ ہر چیز سے باخبروآگاہ ہے۔ یہاں سورہ مبارکہ انفال کی آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں اورسورت برات کا آغاز ہوتا ہے۔ اب میں سورہ برات کے بارےمیں کچھ وضاحت کروں گا اورآئندہ ہفتے انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی جائے گی۔

قرآن مجید میں ایک سورہ ہے جو بسم اللہ سے شروع نہیں ہوتا، وہ ہے سورہ مبارکہ برات قرآن میں ایک سو چودہ سورتیں اس لیے شمار کی جاتی ہیں کہ سورہ برات کو سورہ انفال سے الگ سورت قرار دیا جاتا ہے۔

اس سورہ مبارکہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ ہونے کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ سورہ برات بنیاد طور پر الگ سورہ نہیں، بلکہ یہ سورہ انفال ہی کا تتمہ ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ اس سورہ کی آیات بھی سورہ انفال کی آیات کے مطالب اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ پوچھا جائے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کہیں کہ یہ دونوں ایک سورہ ہیں یا دو سورتیں ہیں۔ اس اثر کی دو وجوہات بصورت فرق بیان کی گئی ہیں۔ ہم شیعوں کا عقیدہ ہے کہ نماز میں سورہ حمد کے بعد ایک مکمل سورہ پڑھنا واجب ہے۔ اگر کہیں کہ ''انفال'' اور''برات'' ایک ہی سورہ ہے تو اگر کوئی شخص نماز میں سورہ انفال پڑھنا شروع کردے تو اسے لازم ہوگا کہ سورہ برات بھی اس کے ساتھ پڑھے۔ اس کے برعکس اگر کہیں کہ ''انفال'' و ''برات'' الگ الگ دو سورے ہیں تو ان میں سے کوئی سی ایک بھی پڑھ لے تو وہی کافی ہوگی بلکہ اس کے بعد دوسری کو پڑھنا جائز ہی نہ ہوگا کیونکہ دو سورتوں کو ایک ساتھ پڑھنا صحیح نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سورہ برات ایک الگ مستقل سورہ ہے۔ اگر یہ کہیں تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ اس کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کیوں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورہ قہرآلود ہے، اس میں کافروں کے ساتھ اعلان جنگ کیا گیا ہے اور انہیں خطرہ سے خبردار کیا گیا ہے۔

یہ سورہ ہجرت کے نویں سال میں نازل ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ پیغمبراکرم چالیس سال کی عمر میں مبعوث بہ رسالت ہوئے تھے، تیرہ سال آنحضرت مکہ میں رہے اور مکہ میں کچھ لوگ اسلام لائے۔ وہ تیرہ سال نبی اکرم اورمسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اوررنج آور تھے۔ پیغمبراکرم نے اپنی عمر کے آخری دس سال مدینے میں بسرفرمائے۔ (پیغمبراکرم ۵۳سال کی عمر میں مدینہ تشریف لے گئے، دس سال مدینہ میں تشریف فرما رہے اور تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت فرماگئے۔) مدینہ کے ان دس سالہ قیام کے ابتدائی چند سال ہجرت سے پہلے کے سالوں سے سخت تر تھے۔

ہجرت کے آٹھویں سال آنحضرت نے مکہ کو فتح فرمایا۔ اس سے قبل بھی مسلمانوں نے کچھ فتوحات حاصل کی تھیں مگر فتح مکہ کے ساتھ ہی جزیرۃ العرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔ اِذَا جَاۗءَ نَصْرُ اللہِ وَالْفَتْحُ۱ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللہِ اَفْوَاجًا۲ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْہُ۰ۭؔ اِنَّہٗ كَانَ تَوَّابًا۳ۧ (اے رسول) جب اللہ کی مدد آپہنچے

اورفتح (مکہ) ہوجائے گی اور تم لوگوں کو دیکھو گے کہ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں تو تم اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اوراسی سے مغفرت کی دعا مانگنا، وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا ہے۔

فتح مکہ کے بعد قریش اورمسلمانوں کے درمیان معاہدہ طے پاگیا۔ کفار قریش نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہر چند کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرچکے تھے۔ یہ اس وقت تھا جب وہ ابھی شرک و بت پرستی کے عالم میں تھے جبکہ مسلمان خدا پرستی کی زندگی بسر کررہے تھے مگر صلح و راستی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ حج کا زمانہ آیا۔ مسلمان مناسک حج بجالانے کے لیے مکہ سے نکلے۔ قریش بھی مکہ سے باہر آئے۔ لیکن قریش کے مراسم حج مسلمانوں کے مناسک حج سے مختلف تھے۔ حج حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے مگر قریش نے اس کو بدعات سے آلودہ کردیا تھا۔ جن کو بعد میں اسلام نے منسوخ کردیا۔ منجملہ یہ کہ جب وہ عرفات کی طرف جاتے تو آگے جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے اورمنیٰ و مشعر تک جاکر واپس لوٹ آتے۔ ایک سال اسی طرح حج ادا کیا گیا، یعنی مشرکوں نے بھی حج کیا اورمسلمانوں نے بھی۔ مسلمان حاجیوں کا اپنا ایک امیر تھا اورمشرکین کا بھی ایک امیر تھا۔ ہجرت کے نویں سال کے شروع میں گمان کیا جاتا تھا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا، یعنی مسلمان اپنا حج بجالائیں گے اورکفار اپنا۔ اسی اثنا میں قریش کی ایک کثیر تعداد معاہدہ کی خلاف ورزی کرچکی تھی، اس لیے مسلمان دوبارہ ان کے ساتھ معاہدہ کرنے پر راضی نہیں تھے۔ اس موقع پر سورہ برات نازل ہوئی۔

اسی موقع پر وہ مشہور واقعہ پیش آیا جو امیرالمومنینؑ کے فضائل کا ایک حصہ ہے۔ شیعوں اورسنیوں کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے، یعنی بعض اہل سنت حضرات نے ایک طرح سے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور اہل تشیع نے دوسری طرح، لیکن بہت سے اہل سنت نے اسی طرح بیان فرمایا ہے جس طرح شیعوں نے بیان کیا ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو مسلمان حجاج کا امیر مقرر کیا گیا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ پیغمبراکرمؐ پر وحی نازل ہوئی (اسے اہل سنت حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں) کہ اس سال سے مشرکوں کو حج میں حصہ لینے کی اجازت نہیں، تمہارا ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے، تمہارے اور ان کے درمیان جنگ کی حالت ہے اور ان کو چار ماہ تک کی مہلت دے دو۔ ان چار ماہ میں کفار آزاد ہوں گے کہ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں اور اس عرصہ میں وہ اپنے لیے کوئی حتمی فیصلہ کرلیں۔ سوال یہ تھا کہ اس غضب آلود پیغام کو کون اعلان کرے! وحی نازل ہوئی کہ آپ خود بنفس نفیس اس کا

اعلان فرمائیں یا وہ اس کا اعلان کرے جو آپ میں سے ہو۔ چونکہ پیغمبراکرم خود جاکر اعلان کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا آنحضرت نے یہ آیات حضرت علی علیہ السلام کے سپرد فرمائیں امیرالمومنین حضرت علی راستہ میں ہی مسلمانوں تک جاپہنچے اس وقت آپ آنحضرت کے مشہور اونٹ پر سوار تھے۔ حضرت ابوبکر ایک خیمہ میں تھے۔ انہوں نے دفعتہً پیغمبراکرم کے اونٹ کی آواز جو سنی تو مضطرب ہوگئے اور سوچا کہ یقیناً یہ میرے لیے کوئی بری خبر لے کر آئے ہیں۔

امیرالمومنین نے فرمایا: آپ اپنے حج کو جاری رکھیں برات میں پڑھ کر سنائوں گا کیونکہ وحی نازل ہوئی ہے کہ سورہ برات آنحضرت خود سنائیں یا وہ سنائے جو ان ہی سے ہو۔''

اہل سنت کی ایک جماعت نے شیعوں ہی کی طرح نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت علی سے سوال نہیں کیا تھا بلکہ وہ پیغمبراکرم کے حکم پر واپس پلٹ گئے اور اس سال انہوں نے حج کیا ہی نہیں تھا۔ امیرالمومنین نے حجاج کی قیادت فرمائی اور سورہ برات بھی لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ اس کی تفسیر ہم آئندہ ہفتے پر ملتوی کرتے ہیں۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

چودھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بَرَاۗءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝۱ۭ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْۗءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڏ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَخَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِــيْمٍ۝۳ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔـا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّــوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُــوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَــلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰي يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝۶ۧ

(توبہ) (یہ) اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کی طرف سے مشرکوں میں سے ان لوگوں کی طرف بیزاری (کا اعلان) ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔ پس (اے مشرکو!) تم زمین میں چار مہینے چل پھر لو اورجان لو کہ تم یقیناً اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اوریہ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن سب لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔ پس اگر تم توبہ کرلو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کروگے تو جان لو کہ تم یقیناً اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اوروہ لوگ جو کافر ہوگئے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو، سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ مشرکین میں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اورنہ تمہارے خلاف کسی کی پشت پناہی کی۔ پس اس کا عہد ان کی مقررہ مدت تک ان کو پورا کردو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ پس جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو قتل کرو مشرکوں کو، جہاں بھی تم انہیں پائو اورانہیں گرفتار کرلو اورانہیں گھیرلو اور ہر گھات کی جگہ میں ان کی تاک میں بیٹھو پس اگر وہ توبہ کرلیں اورنماز قائم کریں اورزکوٰۃ ادا کریں تو تم ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور اگر

مشرکوں میں سے کسی ایک نے بھی تم سے پناہ مانگی ہو تو تم اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنے، پھر اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے ہے کہ یقیناً وہ لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔

یہ سورہ برات ہے۔ گذشتہ ہفتہ ہم نے اجمالی طورپر عرض کیا تھا کہ ایک بات مسلم ہے اوروہ یہ کہ سورہ برات قرآن مجید کی دیگر تمام سورتوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں ہوتا یعنی اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ نہیں ہے۔ اب سوال ہے کہ اس کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ الگ ایک سورہ ہے یا یہ سورہ انفال کا ہی حصہ ہے، الگ سورت نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں ہوتا کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ جب آیات نازل ہوتیں تو مسلمان بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ذریعہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک سورہ مکمل ہوگیا اوریہ دوسرا سورہ ہے، یا وہی سورہ ابھی جاری ہے دستور قرآن کے مطابق جب کوئی سورہ نازل ہوتا تو اگر اس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ آیات ایک الگ سورہ کو تشکیل دیتی ہیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ سورہ برات کا آغاز بسم اللہ کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ الگ سورت نہیں ہے جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ اس میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے۔ یہ آیات ایک الگ سورہ ہی کو تشکیل دیتی ہیں مگر چونکہ یہ سورہ غیظ و غضب کا سورہ ہے اور آیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم رحمت کی علامت ہے لہٰذا اس سورہ کے شروع میں ’’بسم اللہ‘‘ نہیں آئی ہے۔

اس سورہ میں ہم بہت سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جن کا زیادہ تر تعلق دوتین امور سے ہے ان میں سے ایک مسئلہ مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے متعلق ہے۔ مشرک سے مراد وہ شخص ہے جو غیرخدا کی عبادت کرتا ہو، مثلاً جزیرۃ العرب کے بت پرست یا دنیا کے وہ لوگ جو رسمی طور پر ستاروں، سورج، انسان یا آگ کی پوجا کرتے تھے یا واقعی ستاروں، آگ، خورشید یا دریا کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن پاک مشرکین اور دیگر غیرمسلموں یعنی توحید کے قائل خدا پرست غیرمسلموں خصوصاً ان ادیان میں سے کسی ایک کے پیروکاروں جو بنیادی طور پر آسمانی ادیان سمجھے جاتےہیں، کے درمیان فرق رکھتا ہے مشرکین اور غیرمشرکین، جن کو قرآن میں اہل کتاب کا نام دیا گیا ہے، کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات الگ الگ نوعیت کے ہیں اسی سورت میں، بعد میں ہم انشاء اللہ اس بات کی وضاحت کریں گے۔ پس بحث کا ایک حصہ مشرکین سے متعلق ہے اور اس کا آغاز بھی مشرکین سے ہی ہوتا ہے۔

اس سورہ کی بعض آیات اہل کتاب کے بارے میں ہیں۔ اہل کتاب سے مراد وہ غیرمسلم حضرات ہیں جو اپنے آپ کو سابقہ آسمانی کتب میں سے کسی ایک کا پیروکار گردانتے ہیں۔ ان سے مراد یہودی، عیسائی، حتیٰ کہ مجوسی ہیں۔

اس سورہ کے ایک حصہ میں منافقین کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ منافقین کا ذکر بھی اس سورہ میں بہت ہوا ہے۔ منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل سے یا باطن میں مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر اورغیرمسلم ہیں جس کے نتیجہ میں وہ دورخ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کا ایک رخ ان کے اسلام کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا کفر کو۔ جب مسلمانوں کے پاس بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اورانہی جیسا عمل بجالاتے ہیں، جب کافروں کے پاس بیٹھتے ہیں تو ان جیسے ہوجاتے ہیں اور اپنے آپ کو ان میں شمار کرتے ہیں۔ اس سورہ کی چالیس کے لگ بھگ ابتدائی آیات مشرکین کے بارے میں ہیں۔

سورہ برات کے مفہوم کو بہتر طورپر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس مقام سے متعلق تاریخ کے ایک حصے کو سامنے رکھیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلام دین توحید ہے۔ اسلام کسی چیز کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا جس قدر اس نے توحید یعنی خدائے واحد کی عبادت کرنے اور اس کے غیر کی عبادت نہ کرنے کو دی ہے اسلام کسی مسئلہ کی بابت اس مسئلہ جتنا حساس نہیں۔ قریش مکہ مشرک تھے۔ اسی لیے پیغمبراکرم اور قریش کے درمیان جو آپ ہی کے قبیلے کے لوگ تھے، ایک مسلسل چپقلش کا آغاز ہوگیا۔ پیغمبراکرم تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس کے بعد مدینہ تشریف لے گئے جہاں مسلمانوں کو استحکام و قوت و طاقت ملی۔ مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں اورمکہ میں رہنے والے مشرکین قریش کے درمیان غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق اور چند دیگر چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اس کے برعکس غزوہ احد میں مسلمانوں نے شکست کھائی، یعنی پہلے فتح پائی مگر بعد میں ایک غلطی کے نتیجہ میں شکست کھاگئے البتہ بعد میں انہوں نے حالات کو سنبھال لیا۔ غرض غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ غزوہ خندق میں ایک بار پھر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا جس کو گذشتہ تقریر میں عرض کرچکا ہوں۔ حج کے ایام تھے، حرمت والے مہینے تھے جب سب کو حج کے لیے حرم کعبہ کی جانب جانے کی آزادی ہوتی ہے زمانہ

جاہلیت کے دستور کے مطابق قریش کے لیے لازم تھا کہ اپنے دشمنوں کو بھی حج کرنے دیتے تھے مگر انہوں نےپیغمبراکرم اورمسلمانوں کو حج کی اجازت نہ دی۔ پیغمبراکرم قریش کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کے بعد مکہ کے قریب سے واپس تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد قریش نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی اورچونکہ ان کی جانب سے اس کی خلاف ورزی پہلے ہوچکی تھی لہٰذا مسلمانوں کی جانب سے بھی یہ معاہدہ ختم ہوگیا۔ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال پیش آیا۔ ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبراکرم نے مکہ خون بہائے بغیرفتح کرلیا۔ مکہ کی فتح مسلمانوں کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس کی اہمیت فقط فوجی اعتبار سے ہی نہ تھی بلکہ معنوی لحاظ سے زیادہ تھی۔

مکہ عربوں کے لیے ''ام القریٰ'' کی حیثیت رکھتا تھا اورجزیرۃ العرب کا مرکز تھا۔ اسی لیے دیگر علاقہ جات مکہ کے زیراثر تھے اس کے علاوہ عام الفیل کے واقعہ کے بعد جس میں ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی تھی مکہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد تمام عرب اس بات کے معتقد ہوگئے تھے کہ اللہ تعالیٰ خود اس سرزمین کا محافظ ہے اورکوئی جبار اس شہر پر اپنا قبضہ کبھی نہ جماسکے گا۔ جب پیغمبراکرم نے اس قدر آسانی سے مکہ فتح فرما لیا تو انہوں نے اسے اس بات کی دلیل سمجھا کہ آنحضرت حق پر ہیں اوراللہ ان سے راضی ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے لیے یہ فتح بہت زیادہ اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ مسلمان مکہ میں داخل ہوئے۔ مشرکین بھی مکہ میں موجود تھے۔ قریش کے بہت سے افراد بھی آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے گئے۔

اب مکہ میں ایک ایسا دو طرفہ معاشرہ وجود میں آیا جس کے باعث یہاں آدھے افراد مسلمان اورآدھے مشرک ہوگئے، لیکن پیغمبراکرم کی جانب سے مکہ کا حکم مقرر کردیا گیا، یعنی مشرکین اورمسلمان اسلامی حکومت کے زیرسایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ فتح مکہ کے بعد مسلمان اورمشرکین مل کر حج کرنے لگے، لیکن دونوں اپنے اپنے طریقے کے مطابق مناسک حج بجالاتے۔ کفار حج کے موقع پر خاص رسومات بجالاتے تھے جن کو اسلام نے منسوخ کردیا۔ ہم بتاچکے ہیں کہ حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھا جس میں کفار قریش نے بہت تحریف کرلی تھی۔ اسلام نے اس تحریف کی مخالفت کی۔ پھر بھی ایک سال تک کافروں کا حج اسی حالت پر باقی رہا۔

ہجرت کا نواں سال آیا۔ اس سال پیغمبراکرم نے پہلے حضرت ابوبکر کو مامور فرمایا کہ مدینہ سے مکہ جائیں اورمسلمان حاجیوں کی قیادت

کریں۔ لیکن ابھی وہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ جبرائیل امین نازل ہوئے (اس واقعہ کو شیعوں نے بھی نقل کیا ہے اور اہل سنت نے بھی) اورحکم پہنچایا کہ پیغمبراکرم حضرت علی کو مسلمان حاجیوں کا امیر بنائیں اورانہی کو سورت برات سنانے پر مامور فرمائیں۔ اس سورہ میں ان مشرکین کے سوا تمام مشرکین کو دو ٹوک الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا، معاہدہ کی مدت مقرر تھی اورانہوں نے اس کی خلاف ورزی بھی نہیں کی تھی، وہ مشرکین مخاطب تھے مسلمانوں کے ساتھ جن کا معاہدہ نہیں تھا یا اگر معاہدہ تھا تو وہ اس کی خلاف ورزی کرچکے تھے جس کے باعث معاہدہ خودبخود ختم ہوچکا تھا۔ سورہ برات کے اعلان کے یہ معنی ہیں کہ حج کے موقع پر عیدالاضحی کے دن، جب تمام مسلمان، مشرکین جمع ہوں، امیرالمومنین تمام مشرکین کو مخاطب کرکے سورہ برات کی آیات پڑھیں۔ ان آیات میں دوٹوک الفاظ میں مشرکین سے کہا گیا کہ اس وقت سے چار ماہ تک انہیں مہلت دی جاتی ہے اور انہیں آزادی ہے کہ جو فیصلہ چاہیں کرلیں۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا یا اس سرزمین سے کوچ کرگئے، تو ان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا ورنہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ مشرک ہوتے ہوئے مکہ میں رہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا قلع قمع کردیں خواہ تمہارے قتل کی صورت میں ہو، قیدی بنانے کی صورت میں، زندان میں ڈالنے یا کسی اورصورت میں۔ ان چار ماہ میں کوئی بھی مشرکین سے کسی طرح کا تعرض نہیں کرے گا۔ اس طرح مشرکین کو سوچنے کے لیے چار ما تک مہلت دی جاتی ہے۔

اس سورہ کا آغاز لفظ ’’برات‘‘ سے ہوتا ہے۔ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰہَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے مشرکین کے بارے میں اس بات کا اعلان ہے کہ ان کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ ختم کیے جاتے ہیں (بعد والی آیات میں قرآن کریم اس بات کی صراحت فرماتا ہے کہ مشرکین سے مراد وہ مشرکین ہیں جن کے ساتھ تم مسلمانوں نے معاہدے کیے تھے اورانہوں نے ان کی خلاف ورزی کی تھی۔)

امیرالمومنین نے حج کی رسومات میں شرکت فرمائی۔ پہلے مکہ میں معاہدہ ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آٹھ ذی الحجہ کو جب حاجی عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ عرفات میں چونکہ نو ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک وقوف کرنا (ٹھہرنا) واجب ہوتا ہے، حاجی اپنی سہولت کے پیش نظر آٹھ تاریخ کو چل پڑتے ہیں۔ مستحب بھی یہی ہے کہ حجاج آٹھ ذی الحجہ ہی کو منیٰ سے روانہ ہوتے ہوئے عرفات پہنچیں یعنی رات منیٰ میں قیام کریں اور دن کو عرفات کی جانب جائیں۔ نو ذی

الحجہ کو وقوف عرفات بجالائیں، رات کو مشعرالحرام کو لوٹ آئیں پھر اگلے روز منیٰ کی طرف پلٹ آئیں مگر اب یہ مستحب عمل انجام نہیں دیا جاتا، یعنی حاجیوں کی کثرت اوربھاری ٹریفک کی وجہ سے آٹھ ذی الحجہ کی رات کو حاجی منیٰ سے ہوکر جانے کی بجائے مجبوراً طائف کے راستے سے عرفات کو جاتے ہیں اوراگلی رات منیٰ کو لوٹتے ہیں۔ مسجدالحرام میں ایک عام اجتماع میں مشرکین سے مخاطب ہوکر سورہ برات کے مندرجات کا اعلان فرمایا مگر اس بات کے پیش نظر کہ سب لوگ اس اعلان سے باخبر ہوجائیں اورکوئی فرد بھی اس سے بے خبر نہ رہے، امیرالمومنین نے عرفات، پھر اس کے بعد منیٰ جاتے ہوئے بھی متعدد مرتبہ مختلف اجتماعات میں کھڑے ہوکر بلند آواز میں اعلان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایھاالناس یہ آخری سال ہے جس میں مشرکین مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک ہورہے ہیں۔ آئندہ سال سے کسی مشرک کو حج کی اجازت نہیں دی جائے گی اورکسی عورت کو برہنہ ہوکر طواف کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔

قریش کی ایجادکردہ بدعات میں ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اعلان کرررکھا تھا کہ قریش کے علاوہ کوئی شخص اپنا لباس پہن کر طواف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہر شخص کو چاہیے کہ یا تو قریش سے عاریتاً لباس لے یا کرائے پر لے۔ اگر کوئی شخص اپنے لباس میں طواف کرلیتا تو قریش اس سے کہتے تھے کہ اب تمہیں یہ لباس صدقہ میں دینا ہوگا ، یعنی یہ لباس فقرا کو دے دو اس کے لیے وہ لوگوں پر زبردستی کرتے تھے۔

ایک سال ایک کاتون حج کرنے آئی۔ وہ اپنا لباس پہن کر ہی حج کرنا چاہتی تھی۔ قریش نے کہا کہ اس کی اجازت نہیں۔ تمہیں یہ لباس اتار کر یہاں سے دوسرا لباس پہننا ہوگا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اورکوئی لباس ہے ہی نہیں۔ میرے پاس بس یہی ایک لباس ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم سے کرائے پر لباس لے لو۔ اس نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے۔ میں برہنہ ہوکر حج کرلوں گی۔ انہوں نے کہا تمہاری مرضی۔ اس زمانہ میں جو لوگ قریش کا لباس پہن کر طواف نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بالکل برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ امیرالمومنین کے اعلان میں یہ بھی شامل تھا کہ برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ برہنہ ہوکر طواف کرے نیز قریش کی یہ بات بھی کہ ان سے لباس کرائے پر لیا جائے غلط قرار دی گئی۔ یہ بھی فرمایا کہ ضروری نہیں کہ جس شخص نے احرام کے لباس میں یا اس کے علاوہ کسی دوسرے لباس میں (ان کے نزدیک

احرام کا لباس ضروری نہیں تھا) طواف کیا ہو تو وہ اس لباس کو فقرا کو دے دے بلکہ وہ اسے اپنے پاس خود اپنے استعمال کے لیے سنبھال کر رکھے۔

بہرحال امیرالمومنینؑ تشریف لائے اور آپ نے بارہا مختلف مقامات پر لوگوں کے سامنے یہ اعلان فرمایا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ امیرالمومنینؑ نے بارہا یہ اعلان کیا یہاں تک کہ آپ کی آواز بیٹھ گئی۔ امیرالمومنینؑ نے اس مقصد کے پیش نظر مختلف مواقع پر ہر اجتماع کے سامنے اعلان فرمایا تاکہ کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو بعد میں کہے کہ میں نے یہ اعلان نہیں سنا تھا۔ جب امیرالمومنینؑ تھک جاتے اور آپ کی آواز بیٹھ جاتی تو دیگر صحابہؓ کرام آپ کی نیابت کے لیے تشریف لاتے اور انہی آیات مبارکہ کا اعلان فرماتے۔ اہل سنت حضرات اور شیعوں کے درمیان سورہ برات کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر اہل سنت نے نقل فرمایا ہے کہ جب نبی اکرمؐ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ یہ سورہ یا آپ خود پڑھ کر سنائیں یا وہ سنائے جو آپ سے ہو اور آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو یہ فریضہ سونپا تو حضرت علیؑ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ امیرالمومنین علیؑ کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ پریشان ہوگئے پوچھا کہ آپ امیر بن کر آئے ہیں یا قاصد؟ یعنی کیا آپ حاجیوں کے امیر بننے کے لیے آئے ہیں یا کسی خاص کام کی غرض سے آئے ہیں؟ فرمایا ''مجھے خاص ذمہ داری سونپی گئی ہے اور میں فقط اسی کے لیے آیا ہوں'' لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کو ان کی ذمہ داری سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مقررہ ذمہ داری پوری کی اورامیرالمومنینؑ نے اپنی ذمہ داری کو انجام دیا۔ لیکن بعض اہل سنت (جیسا کہ مجمع البیان میں نقل ہوا ہے) اور سب اہل تشیع کہتے ہیں کہ جب امیرالمومنینؑ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اپنے منصب سے معزول ہوکر مدینہ واپس لوٹ گئے۔ ارشاد قرآن حکم کی تعبیر یہ ہے کہ اس سورہ کو یا تو آنحضرتؐ خود اعلان فرمائیں یا وہ جو آنحضرتؐ ہی سے ہو۔ اہل تشیع ان الفاظ ''تم سے ہو'' یعنی ''رجل منک'' ایک خاص مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ اب میں اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

قرآن پاک میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّہٗ مِنِّيْ۰ۚ (ابراہیم:۳۶) یعنی جو شخص میرے نقش قدم پر چلے گا وہ مجھ سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مجھ سے الگ نہیں ہے۔ پیغمبراکرمؐ نے حضرت سلمانؓ فارسی کی توصیف میں سب سے زیادہ اہم جملہ فرمایا بلکہ حضرت امیرالمومنینؑ کے علاوہ کسی صحابی کی تعریف میں بھی جو اہم ترین جملہ فرمایا یہ ہے: سلمان منا اھل البیت سلمانؓ ہم اہل بیتؑ سے ہے۔ یہ الفاظ ''ہم سے ہے'' بہت بلندپایہ ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ

ہے کہ وہ ہم سے الگ نہیں ہیں یعنی ہم میں جدائی نہیں پائی جاتی ہے۔ کسی نے کہا من کی ام لیلی ولیلی کیست من یعنی (میں لیلیٰ کا کیا لگتا ہوں اورلیلیٰ میری کیا لگتی ہے) میں لیلیٰ سے ہوں اور لیلیٰ مجھ سے ہے۔ اس سے بہتر تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

ایک اور حدیث جس کو شیعہ اورسنی دونوں نے نقل کیا ہے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ پیغمبراکرم نے امام حسین کے بارے میں فرمایا حسین منی و انا من حسین یعنی حسین مجھ سے ہیں اورمیں حسین سے ہوں۔ یعنی حقیقتاً ارے درمیان مغائرت فرض بھی نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ہی ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث اور دوسری مشہور حدیث یعنی علی مع الحق والحق مع العلی یدور حیث مادار یہ دونوں حدیثیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں۔ علی حق کے ساتھ ہیں اورحق علی کے ساتھ ہے۔ حق اسی طرف مڑتا ہے جس طرف علی مڑتے ہیں، یعنی علی وہاں ہیں جہاں حق ہے اور جہاں حق ہے وہاں علی ہیں، یعنی ان دونوں میں علیحدگی کا کوئی وجود نہیں۔ ''عصمت'' کے بھی تقریباً یہی معنی ہیں۔ بالفاظ دیگر علی اور حق کے درمیان کسی طرح کی جدائی نہیں پائی جاتی سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبراکرم حق سے دوری رکھتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبراکرم ''نعوذباللہ'' کوئی ایسی بات کریں یا کوئی ایسا عمل انجام دیں جو حق نہ ہو؟ جس طرح پیغمبراکرم کا حق سے الگ ہونا ممکن نہیں، ان میں مغائرت کا پایا جانا ناممکن ہے، ویسے ہی علی اورپیغمبراکرم میں بھی مغائرت ناممکن ہے۔

اس جملےکو کہ اس سورہ کو آپ خود یا جو آپ سے ہو، کے علاوہ کوئی شخص پڑھ کر نہ سنائے، فقط اہل تشیع ہی نے نقل نہیں کیا بلکہ اہل سنت نے بھی اس کو بالکل اسی طرح نقل فرمایا ہے۔ اگر اختلاف ہے تو صرف حضرت ابوبکر کے جانے یا نہ جانے میں ہے، جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے تو وہ اس جملہ میں ہی ہے، حضرت ابوبکر خواہ گئے ہوں یا نہ گئے ہوں بلکہ اگر حضرت ابوبکر حج کے لیے گئے ہوں تو اس سے حضرت علی کی فضیلت اورزیادہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے ہوتے ہوئے بتایا جارہا ہے کہ اس سورہ مبارکہ کی تبلیغ کے لیے وہ مناسب نہیں ہیں اورنص قرآنی کے مطابق لوگوں کو اس قسم کا پیغام پہنچانے کی صلاحیت صرف اس شخص کو حاصل ہے جو پیغمبراکرم سے ہو اوراس کے اورپیغمبراکرم کے درمیان کسی قسم کی بھی مغائرت نہ پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی سے سورہ برات کو پڑھوایا جانا آپ کے عظیم فضائل میں شمار ہوتا ہے۔

اب ہم مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے مسئلہ تک آن پہنچے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ چند مطالب پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ یہ سورہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین کے ساتھ کیے ہوئے کسی عہد کے پابند نہیں ہیں، یہ آیہ مجیدہ مشرکین کو صرف چار ماہ کی مہلت دیتی ہے کہ ان چار ماہ میں آزادی سے جہاں چاہیں چلے جائیں اور اپنے بارے میں حتمی فیصلہ کرلیں۔ ان پر اتمام حجت فرماتی ہے اورپورے وثوق کے ساتھ انہیں بتلا رہی ہے کہ اس وقت ان سے ہمیں کوئی غرض نہیں کیونکہ مشیت الٰہی یہ ہے کہ کوئی مشرک اس سرزمین پر نہ رہنے پائے۔ تم اللہ کے مقابلہ میں آکر کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔ یہ آیہ پاک ان کو نصیحت کرتی ہے کہ توبہ کریں، لوٹ آئیں اوریہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ معاہدہ ختم کرنے کے اس عام اعلان سے ان مشرکین کو مستثنی قرار دے رہی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں نے معاہدات کیے اور انہوں نے کسی طرح ان کی خلاف ورزی نہ کی، مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا اور ان کے کسی دشمن کی حمایت و نصرت نہ کی۔ قرآن صراحت کے ساتھ مسلمانوں سے کہتا ہے کہ جب تک ان کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی مدت تمام نہ ہوجائے اس معاہدہ کا احترام کریں۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے مشرکین چار ماہ گزرنے کے بعد محترم نہیں رہیں گے۔ (قرآن پاک چار ماہ کی مدت تک ان کے احترام کا قائل ہے) اس مدت کے بعد ان کے قتل کا حق مسلمانوں کو حاصل ہوگا ، انہیں قید کرنے کا حق بھی ہوگا اورگرفتار کرنے کا بھی۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہوگا کہ ان کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں لیکن اگر وہ توبہ کرلیں اورمسلمانوں کے راستے پر چل پڑیں تو مسلمان انہیں چھوڑسکیں گے۔

دوسری آیت اگر کوئی مشرک حقائق کو سننے کے لیے مسلمانوں سے امان مانگے تو اسے امان دے دی جائے، اسے اللہ کا کلام سنایا جائے اور اس کے بعد اسے صحیح و سالم اس کے محفوظ مقام تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ہمارے مذکورہ احکام ان مشرکین کے بارے میں ہیں جو حق بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے نہیں آتے، لیکن اگر کوئی مشرک حق بات کو سننے اورسمجھنے کا خواہش مند ہو تو اس کو نہ روکو اگر وہ تم سے امان مانگے تو اس کو امان دو، صرف یہ نہیں کہ اس کو نہ روکو بلکہ خود اس کی حفاظت کرو اور اسے اس کے محفوظ مقام تک پہنچادو۔

عقیدے کی آزادی

دوسرا مطلب جسے عرض کرنا ضروری ہے اورخصوصاً موجودہ زمانہ میں اس پر زیادہ بحث ہوتی ہے، یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اسلام یہ جو

کہہ رہا ہے کہ جن مشرکین کے ساتھ تمہارا معاہدہ نہیں ہے یا جنہوں نے معاہدہ کیا تھا مگر بعد میں اس کی خلاف ورزی کی، ان کو کسی صورت میں بھی برداشت نہ کرو، ان کو مہلت دو، اگر اس مہلت کے بعد وہ توبہ کرلیں اور اسلام لے آئیں تو ٹھیک ورنہ اگر توبہ نہ کریں اوراپنی بات پر قائم رہیں تو ان کو قتل کردو سوائے اس کے کہ اگر وہ حقیقت کو سمجھنے کے لیے تمہارے پاس آئیں تو ان کو امان دو۔ بصورت دیگر ان کو موت کے گھاٹ اتاردو کیا یہ بات عقیدہ کی آزادی کے، جس کو دورحاضر میں انسانی حقوق کا حصہ شمار کیا جاتا ہے، منافی نہیں ہے؟ اگر یہ دورحاضر کی ضروریات کے منافی ہے تو پھر اس کو کس طرح درست سمجھا جاسکتا ہے؟ عقیدہ کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے، یعنی انسان کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہونا چاہیے۔ انسانی حقوق کا قانون کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کے عقیدے کی بنا پر اس سے متعرض ہو۔ حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ مشرکین کو کسی صورت میں بھی برداشت نہ کرو۔ اسلام ان لوگوں سے متعرض نہیں ہوتا جو شرک کے علاوہ کوئی اور دین مثلاً عیسائیت، یہودیت یا مجوسیت اختیار کیے ہوئے ہوں لیکن مشرکین کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ پہلے ان کو مہلت دو اور اگر وہ مقررہ شرائط کے تحت سرتسلیم خم نہ کریں تو ان کا قلع قمع کردو۔ کیا اسلام کا یہ حکم حقوق انسانی کے اس قانون سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ حکم خود دوسرے قرآن قانون سے مطابقت رکھتا ہے؟ کیا قرآن نے یہ نہیں فرمایا: لَآ اِكْرَاہَ فِي الدِّيْنِ۰ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۰ دین کے معاملہ میں کوئی جبروزبردستی نہیں ہے۔ پس قرآن مجید ایک طرف تو کہہ رہا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبروزبردستی نہیں ہے اور دوسری طرف بیزاری کا اعلان فرما رہا ہے: بَرَاۗءَۃٌ مِّنَ اللہِ وَرَسُوْلِہٖٓ پھر اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْہُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْہُمْ (جب یہ چند مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو۔) ایسا کیوں ہے؟ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْہُمْ جبکہ لَآ اِكْرَاہَ فِي الدِّيْنِ۰ بھی ہے۔ عہدحاضر میں عقیدہ کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کو فطری اور طبیعی طورپر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ اب اگر کوئی شخص کسی کے عقیدہ کی بنا پر اس کے خلاف ہو تو اس نے گویا انسان کے فطری و پیدائشی حقوق کو اس سے چھیننے کی کوشش کی اور حقیقت میں اس نے ظلم کیا۔

لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ انسان فطری و پیدائشی حق تو رکھتا ہے لیکن انسان کا فطری اور پیدائشی حق یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ جو عقیدہ بھی اپنالے اس عقیدہ کی بنا پر اس کا حق محترم بھی شمار ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے قابل احترام ہے، لہٰذا انسان کا ارادہ و انتخاب بھی قابل احترام ہوگا ۔ انسان خود اپنے لیے جس چیز کا بھی انتخاب کرلے تو بحیثیت انسان اس نے اپنی مرضی سے انتخاب کیا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس کے مانع آنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن اسلام کے نزدیک یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلام انسان کو قابل احترام قرار دیتا ہے مگر کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا انتخاب بھی لائق احترام ہو، یا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی صلاحیتیں اورکمالات لائق احترام ہیں؟ انسان کے محترم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی صلاحیتیں اورکمالات محترم ہوں، یعنی اس کی انسانیت محترم ہو۔

میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ انسان ان عظیم صلاحیتوں کے باعث انسان ہے جو اس کی فطرت کو ودیعت ہوئی ہیں۔ قرآن بھی فرماتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل:۷۰) ہم نے بنی آدم کو محترم اورموردِاکرام قرار فرمایا۔ انسان غوروفکر اورسوچ و بچار کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حصول علم کی استعداد رکھتا ہے جو جانوروں، نباتات اورجمادات کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے انسان جانورونباتات کے مقابلہ میں محترم ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا (بقرہ:۳۱) اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اسما اوراپنے رموز کی تعلیم فرمائی۔ یہ نہیں فرماتا کہ بھیڑ، بکری، گھوڑے یا اونٹ کو بھی ان کی تعلیم دی۔ انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ صاحب علم ہو۔ انسان کے پاس اخلاقی و معنوی صلاحیتوں کا ایک مجموعہ ہے جن سے وہ عظیم اخلاقی فضائل اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے، بلندپایہ جذبوں کا مالک ہوسکتا ہے، جبکہ یہ کمالات جمادات و نباتات میں کوئی بھی اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا۔ انسان اپنی مخصوص جسمانی ساخت کی بنا پر انسان نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی دو ٹانگوں کے ساتھ چلتا ہو، باتیں کرتا اورکھانا کھاتا ہو وہ انسان کہلانے کا حق دار ہوجائے گا۔ وہ بالقوۃ تو انسان ہوسکتا ہے بالفعل نہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ایسا انسا ن دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم ڈھائے، یعنی جو انسان ہوتے ہوئے اپنے ہاتھوں اپنی انسانیت کا گلا گھونٹ دے۔ میں ایسابنوں کہ انسان پر ظلم ڈھائوں ۔ اگر میں اپنے اختیار سے انسانی کمالات کے خلاف اقدام کروں تو میں انسان دشمن انسان ہوں گا بلکہ حقیقت میں انسان دشمن حیوان ہوں گا۔ اگر میں علم سے دشمنی برتنے لگوں اورکہوں کہ علم انسان کے لیے مضر ہے تو میں ایسا انسان ہوں گا جو انسان کا دشمن ہو بلکہ ایسے شخص کو ''انسان دشمن انسان'' کہنا بھی غلط ہے، اسے تو ''انسان دشمن حیوان'' کہنا چاہیے یہ ایک ایسا بالقوۃ انسان ہے جو حقیقی اورصحیح انسانیت کا دشمن ہے۔ اگر میں سچائی و امانت کی جو انسانی اقدار ہیں، مخالفت کروں اور ''میکیاولی'' کی مانند سیادت کا قائلہوجائوں

اور کہوں کہ اخلاق، انسانیت، شرافت اورامانت تو بااثر افراد کے ہاتھ میں کمزوروں کو کچلنے کے ہتھکنڈے ہیں اور اصل بنیاد سیادت ہے۔ اس صورت میں میں ایک ''انسان دشمن انسان'' کہلائوں گا۔

انسان کی صلاحیتوں میں عظیم ترین صلاحیت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ یٰٓاَیُّہَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (انشقاق:۶) یعنی اے انسان تو جس قدر محنت و مشقت سے، اطاعت و عبادت سے، حضوری پروردگار کی کوشش کرے تو ضرور اس کے حضور حاضر ہوگا۔ یہ صلاحیت عقیدہ توحید سے مشرف ہونے میں مضمر ہے جس میں دنیوی و اخروی سعادت دونوں شامل ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی انسان اصول توحید کی مخالفت کرتا ہے تو وہ انسانیت دشمن انسان ہے بلکہ وہ ''انسان دشمن جانور'' ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کی آزادی اور اس کے احترام و بزرگی کا معیار یہ ہے کہ انسان راہ انسانیت پر گامزن ہو۔ انسان کو صرف انسانیت کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے آزاد ہونا چاہیے یہ نہیں کہ اسے ہر اس چیز کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے جس کا اس نے خود انتخاب کیا ہو خواہ اس کا انتکاب انسانیت ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو لوگ بنیادی طور پر انسان کی آزادی کے داعی نہیں یہ کہتے ہیں کہ انسان کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہونی چاہیے، یعنی انسان کو ہر شعبہ میں ہر پہلو سے آزاد ہونا چاہیے ان کا کہنا ہے کہ عقیدے کے انتخاب میں آزادی بھی انسان کا بنیادی حق ہے لیکن انسان بسااوقات ایسے عقائد کو بھی اپنالیتا ہے جو انسانیت کے دشمن یعنی اس کی اپنی ذات ہی کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

علم اور عقیدے میں فرق

جاننا چاہیے کہ علم و عقیدے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ علم وہ کیفیت ہے جو منطق کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ انسان کے لیے علم کی آزادی ہونا لازم ہے۔ جس شخص نے علمی نظریات میں غوروخوض کیا ہو اورآزادی فکر کی مدد سے کسی نظریہ کا انتخاب کیا ہو اس کے لیے اس انتخاب میں آزاد ہونا ضروری ہے لیکن انسان جب عقیدہ کا انتخاب کرتا ہے تو اس کے انتخاب کی بنیاد تفکر پر نہیں ہوتی۔ لہٰذا عقائد پر تقلید غالب ہوتی ہے جس کی بنیاد اکابرین، سرکردہ افراد اوربزرگوں کی تقلید پر رکھی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق انسان اکابرین سے متاثرہوکر کسی عقیدہ کا قائل ہوتا ہے، والدین و آباواجداد سے متاثر ہوکر کسی عقیدہ کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے۔ ایسے انسان کو عقیدہ یعنی اعتقادی رجحان کی آزادی کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے جو ماحول یا اکابرین اور سرکردہ شخصیات کی کورانہ تقلید پر مجبور ہو اور اسے کسی غرض کے تحت اس

عقیدہ کا قائل بنالیا گیا ہو؟ اس آزادی کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی شخص غلطی سے خود اپنے ہاتھ پائوں زنجیر میں جکڑ لے۔ اورپھر ہم کہیں کہ چونکہ اس نے خود اپنے ہاتھ پائوں میں زنجیر ڈالی ہے جو اس کی اپنی مرضی و ارادہ سے ہے لہٰذا اسے اس بات کی آزادی حاصل ہے۔ چونکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ پائوں میں زنجیر باندھی ہے لہٰذا انسانی حقوق ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اس کے ہاتھ پائوں اس زنجیر سے آزاد کریں پھر وہ خود احتجاج کررہا ہے کہ اس کی زنجیر تقلید کو نہ کھولا جائے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

ایک مشہور داستان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی دیہات کے لوگ خارش میں مبتلا ہوگئے۔ اتفاق سے ایک طبیب کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے ان کی بیماری کی تشخیص کی جس کے لیے وہ دوا بھی جانتا تھا۔ مگر لوگ اس بیماری کے عادی ہوچکے تھے، اس سے مانوس ہوچکے تھے اور انہیں اپنا بدن کھجانے کی عادت پڑچکی تھی۔ طبیب نے اس خیال سے کہ سب لوگ اس کی تجویز کو قبول کرلیں گے، کہا کہ وہ ان کا علاج کرنے پر تیار ہے لوگوں نے شور مچادیا کہ طبیب وہاں سے چلا جائے، ہمیں اس سے کیا مطلب! مگر طبیب جانتا تھا کہ لوگ سب بیمار ہیں۔ اس نے ایک شخص کا اسے بہلا پھسلا کر علاج کیا۔ جب وہ شخص صحت یاب ہوگیا تو اس کو اپنی تندرست حالت اچھی لگی اوراس نے سوچا کہ یہ بھی کوئی کاموں میں کام تھا جو وہ کیا کرتا تھا کہ ہمیشہ زیربغل، سینے یا پائوں کو کھجاتا رہتا تھا۔

طبیب نے اسی طرح چند دیگر افراد کا بھی علاج کیا اورجب اس نے اپنی حمایت پیدا کرلی تو سب علاج پر مجبور ہوگئے۔ اس سلسلہ میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ کیا اس طبیب نے برا کیا کیونکہ لوگ اس پر راضی نہ تھے؟ معلوم ہوا کہ مرضی عوام تو کوئی معیار نہیں ہوسکتا یہی کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے انسان کی جہالت اس کے دل کو مریض ہونے کا خواہشمند بنادے۔

دوسری داستان مولانا روم بیان فرماتے ہیں جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

عاقلی بر اسپ می آمد سوار

بر دھان مردہ ای می رفت مار

داستان یہ ہے کہ ایک عقل مند، دانا، گھوڑے پر سوار ایک درخت کے قریب پہنچا جس کی چھائوں میں ایک تھکا ماندہ شخص سویا ہوا تھا۔ وہ

خراٹے لے رہا تھا اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اتفاق سے جب یہ سوار وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کیڑا اس سوئے ہوئے شخص کے منہ تک پہنچ چکا ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیڑا اس سوئے ہوئے شخص کے منہ میں داخل ہوگیا اوربے خبری کے عالم میں اس شخص نے اس کیڑے کو نگل لیا۔ وہ سوار سمجھدار آدمی تھا اورجانتا تھا کہ یہ کیڑا زہریلا ہے اگر اس شخص کے معدہ میں رہا تو اسے مارڈالے گا۔ چنانچہ وہ فوراً گھوڑے سے اترا خوابیدہ شخص کو بیدار کیا۔ سوار نے سوچا کہ اگر وہ اس خوابیدہ شخص کو بتائے گا کہ اس کے معدہ میں ایک زہریلا کیڑا چلا گیا ہے تو وہ شاید یقین نہیں کرے گا اور اگر اس نے یقین کر بھی لیا تو وحشت زدہ ہوجائے گا پھر ممکن ہے یہ وحشت ہی اس کا کام تمام کردے!

سوار کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس شخص کا علاج صرف یہی ہے۔ لہٰذا اس نے زبردستی اسے نیند سے بیدار کیا۔ جب اس نے جاگ کر ایک اجنبی سوار کو دیکھا تو پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے سوار نے اس شخص کو اٹھنے کو کہا۔ اس نے پوچھا: ’’تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟‘‘ سوار نے جب دیکھا کہ یہ اس طرح نہیں اٹھے گا تو چند کوڑے اس کے سرپ پر رسید کیے جس سے وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ سوار نے وہاں پڑے ہوئے کچھ گندے، بدبودار سیب اس کو کھانے کو دئیے تاکہ اسے قے ہوجائے اورکہا کہ یہ سیب تمہیں کھانا پڑیں گے۔ خوابیدہ شخص نے بہت کہا کہ آخر انہیں کیوں کھائے۔ سوار نے کہا: ’’تمہیں کھانا ہوں گے۔‘‘ پھر زور سے کوڑا اس کے سر پر مارتے ہوئے حکم دیا کہ انہیں فوراً کھائے۔ آخر اس شخص کو وہ سیب کسی طرح اپنے حلق سے اتارنے پڑے۔ پھر وہ سوار اپنے گھوڑ پر سوار ہوگیا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس شخص نے پوچھا: ’’آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں کہاں جائوں؟ اس سے پہلے میرا تم سے کیا تعلق رہا ہے؟ تم میرے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟ شاید تم غلطی سے مجھے اپنا کوئی دشمن سمجھے ہوئے ہو‘‘ سوار نے کہا: ’’دوڑپڑو‘‘ اس نے حیل و حجت کی لیکن سوار نے اس کے سر پر کوڑا مارتے ہوئے حکم دیا کہ بھاگے۔ وہ شخص شور مچاتا رہا، روتا رہا مگر دوڑنے کے علاوہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا(ان لوگوں کی طرح جو افیون کھاتے ہیں اور قے کرنے کے لیے دوڑتے ہیں) سوار نے اس شخص کو گھوڑے کے آگے آگے اتنا بھگایا کہ اس کا جی متلانے لگا اوراس نے قے کرکے سیبوں کو اگل دیا ان کے ساتھ ہی مرا ہوا وہ کیڑ ابھی باہر نکل آیا۔ اس نے وحشت زدہ ہوکر پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ سوار نے کہا کہ اب تم نے اس سے نجات پائی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اسی کیڑے کو نکالنے کے لیے کیا تھا۔ اس شخص نے ماجرا دریافت کیا تو سوار نے کہا: میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ تمہیں اس کیڑے کو نگلتے ہوئے دیکھا۔ تم اس وقت بے

خبر سوئے ہوئے تھے۔ اگر تھوڑی دیر تک تم اسی طرح سوئے رہتے تو موت کے منہ میں چلے جاتے۔ میں نے اس خوف سے تمہیں پہلے نہ بتایا کہ کہیں تم خوف زدہ نہ ہوجائو۔ یہ سیب بھی تمہیں میں نے اسی لیے کھلائے تھے اور اس کے بعد اس لیے بھگایا تھا کہ قے کردو۔ اب جبکہ تم قے کرچکے ہو تم سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا۔ خداحافظ! وہ شخ صوار کے ساتھ ساتھ بھاگتا اور اس کے پائوں چومتا رہا وہ اس سوار کو جانے نہیں دے رہا تھ ااورکہتا تھا: ’’تم فرشتے ہو! تم کو اللہ نے بھیجا ہے۔ تم کتنے اچھے آدمی ہو‘‘ لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان جو چاہتا ہو اور جس کا اس نے انتخاب کیا ہو وہ اس کا حق بھی ہو۔ انسان کے کچھ حقوق ضرور ہیں لیکن اس کے حقوق وہ ہیں جو انسانیت سے متعلق ہوں، اس کے حقوق میں وہ آزادی ہے جو انسانی ہو۔ یعنی جو انسانیت سے تعلق رکھتی ہو۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے کہ وہ تمام مخلوقات کو اپنا خدمت گار بنالے اورجان لے کہ وخلقنا لکم ما فی الارض جمیعا یہ لکڑی، یہ پتھر، درخت، سونا، چاندی، فولاد، لوہا، پہاڑ، دریا، معدن اوریہ تمام چیزیں اس کی خدمت گار ہونی چاہئیں، اسے صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرنا چاہیے، پھر ایسا انسان اگر کھجور، پتھر یا لکڑی کی عبادت کرنے لگے تو وہ ایسا انسان ہوگا جو اپنی مرضی سے انسانیت کے راستہ سے بھٹک گیا ہو اور چونکہ وہ انسانیت کے راستے سے بھٹک گیا ہے لہٰذا انسانیت و حقوق انسانی کے پیش نظر جیسے بھی ہو اس کے ہاتھ پائوں کو اس زنجیر سے نجات دلانا لازم ہوگا۔ اگر ممکن ہو تو اسے ضرور ان رکاوٹوں سے نجات دلانا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم دوسروں کے راستے سے تو اسے ضرور ہٹا دینا چاہیے۔ آئندہ ہفتے عقیدہ کی آزادی اورآیہ مبارکہ لَآ اِكْرَاہَ فِي الدِّيْنِ۰ۣ پر مزید بحث کی جائے گی۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

حوالہ جات

۱۔ اس سال ہمیں حج کا شرف نصیب ہوا۔ ہم نے سوچا کہ پیغمبراکرم کے آثار کو دیکھنا ہماری روایات میں شامل ہے۔ ہم نے چاہا کہ خیبر کو جو مدینہ کے شمال میں واقع ہے، دیکھیں (ہم ایرانی لوگ عموماً کار یا بس پر کم ہی ادھر سے گزرتے ہیں، اس لیے مدینہ کے شمالی مقامات کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہم نے خیبر اور تبوک دیکھنے کے لیے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ مدینہ سے تبوک تک سو فرسخ کافاصلہ ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ جیش العسرۃ کو تبوک کی جانب لے جانا کتنا اہم فیصلہ تھا۔ زادسفر کی کمی اورشدید گرمی، جس میں فصل خرما پکتی ہے، کی بنا پر اس لشکر کو ''جیش العسرۃ'' کا نام دیا گیا۔

۲۔ نہج البلاغہ ، نامہ ۲۶۔

۳۔ نہج البلاغہ ، حکمت ۲۱۹۔

۴۔ نہج البلاغہ ، حکمت ۲۱۲۔

۵۔ سورۂ توبہ آیت۴۰۔

۶۔ ایک تو اس تقریر کا کیسٹ دستیاب نہیں ہوا ، دوسرے اس تقریر کو تلخیص کی صورت میں لکھا گیا تھا جو تصحیح شدہ نہ تھی، اس لیے ممکن ہے کہ بعض عبارتیں استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی اصل عبارات نہ ہوں۔

۷۔ سورۃ ''ص'' آیت۸۲۔

۸۔ سورۃ ''ص'' آیت۷۹۔

۹۔ سورۃ ''نمل'' آیت۱۴۔

۱۰۔ سورۃ : انعام آیت۶۵۔

۱۱۔ سورۃ : توبہ آیت۱۴۔

۱۲۔ سورہ ''حج'' آیت۲۵۔

۱۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب۶۷۔

۱۴۔ سورۃ بقرہ: آیت۱۲۵۔

۱۵۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۔

۱۶۔ اردو میں ''آمرزش'' کے معنی مغفرت اوربخشش ہیں (مترجم)

۱۷۔ یا کہتا ہے: ما نصیحت بہ جای خود گفتیم ورفتیم